



اُقا مُحَمَّد

شوشکانی

سے
۱۳۴۰

۵۵۶۶۳
۱۳۳۱۵
۶۰۱۲۹۴۷

اقبالِ مُحَمَّد

(اقبال کے سوانح و افکار کی آڑ میں
نزدِ بیکان بے بصر کے ملفوظات کا جائزہ)

۱۳۴۰
جیتو

شَوْرَشْ كَا شَمِيرِي

جملہ حقوق اشاعت طباعت بھی صنعت محفوظ ہے

اشاعتِ اول

۲۱ اپریل ۱۹۰۳ء

تعداد	ایک ہزار
مطبع	چنان زینگ پریس
ناشر	ادارہ مطبوعاتِ چنان
قیمت	۸۸ - میکلود روڈ - لاہور
رد پسیہ	بیسے

مجید نظامی ایڈٹر نو اتے وقت کے نام

شمع مجفل کی طرح سب سے جداسب کارفیقی

ذکرِ اقبال (عبدالجید سالک) شعرِ اقبال (عبداللہ عابد) فکرِ اقبال (خلیفہ عبد الحکیم)

پر ایک پھٹکتی ہوئی زگاہ

مُصطفیٰ کے قلم سے

فریضی

(۱) اقبال اور ظفر علی خاں

(۲) اقبال اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری

سراغاز

زیر نظر کتاب میں ایک اجتماعی ابتدائیہ کے بعد تین کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے:

۱۔ ذکرِ اقبال، مُرتَبہ: عبدالمجید سالک

۲۔ شعرِ اقبال، مُؤلَّفہ: سید عابد علی عابد

۳۔ فکرِ اقبال، مُصْنَفہ: خلیفہ عبد الحکیم

ابتدائیہ میں جو کچھ عرض کیا وہ راقم کا اقبالیات کے متعلق ایک عمومی تاثر ہے یہ
مک جو اقبالؒ کے تصور کی تحریک پر قائم تھا، اس کے دانشوروں کی ایک بڑی ٹھیک
نے اقبالؒ کے سوانح و افکار کو سرکاری اکادمیوں کے زرِ اعانت سے مستفید ہو کر
مجروح کیا۔ ان کے قلم سے آج تک اقبالؒ کے سوانح و افکار پر کوئی نمائندہ کتاب
نہیں آتی۔!

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۵۶ء میں راقم کو یاد فرمایا تو اختر مولاناؒ کے حسب
ارشاد اقبالؒ کے مجموعہ ہاتے کلام اور اپنے صوابدید پر اقبالؒ سے متعلق کئی ایک مکتبانی
کتابیں ساختے گیا۔ مولاناؒ نے ان کتابوں پر ایک چھپلتی ہوتی نگاہ ڈالی اور فرمایا:
”اقبال اس سرزین میں مسلمانوں کی نئی نسلوں کے ہلی شعور کی طاقت“

آواز تھے۔ انہوں نے عظیم کے مسلمانوں کی ذہنی سوانح عمری کا مورد جمع کیا، لیکن ابھی تک اس رعایت سے شاید کسی مُصنف یا مُترّف نے اُن کی ذہنی سرگزشت پر قلم نہیں اٹھایا۔ اقبال نے بعض مباحثت سے قطع نظر مسلمانوں کی جد آگانہ ہستی کو غایت درجہ متاثر کیا اور ان کے ذہنی عمل کی جذباتی فضا کو پروان چڑھایا۔ لیکن ان کتابوں میں شاید وہ چیز نہیں ہے۔ اقبال تعدد نظر کا نہیں، غور و فکر کا شاعر ہے۔ پاکستان بن گیا تو اب ان کے تصوّراتی خطوط ہی پر فائم رہ سکتا ہے۔“

راقم کے لیے تیقین سے یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا کے الفاظ تمام و کمال ہی ہی تھے، ایک دو الفاظ کا تغیر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ راقم نے مولانا سے ملاقات کے پانچ چھ گھنٹے بعد اقامت گاہ میں آگر روز نامچہ لکھا، اور اب اُنہی الفاظ کو نقل کیا ہے۔ قارئین آگاہ ہیں کہ اقبال و آزاد میں ایک عظیم ذہنی فاصلہ تھا۔ دونوں کے میدان مختلف تھے لیکن اقبال سے متعلق مولانا نے جو کہا، افسوس کہ اقبالی ادب اُن سوانح و افکار سے خالی ہے۔ اقبال اب ایک سالانہ قومی عُرس ہے یا شاعری کے روز بazar کا ادبی میلہ۔! اقبال نے جو کہا اور جو چاہتے تھے، اُس سے متعلق پاکستانی ادب کے مختلف ذخائر میں ایک زبردست خلاموجرد ہے۔ اس ابتدائیہ میں اسی خلاکے متعلق اشارات کیے گئے ہیں۔

جن تین کتابوں کا احتساب کیا گیا، ان کے مُصنف اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ راقم اُن کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بُدعا ہے۔ مولانا عبد الجبار سالک کی سیاست سے تصادم کے باوجود راقم کو اُن سے اخلاص تھا، اور وہ خود راقم سے اخلاص برتبے تھے۔ راقم نہیں چاہتا تھا کہ ”ذکر اقبال“ کے متعلق کچھ لکھے لیکن قادریانی دجل نے مجبوہ کیا۔ راقم نے سالک سے ارادت کے آگینہ کو فائم رکھتے ہوئے اُن کے تامُحات پر قلم اٹھایا ہے۔

حابد علی عابد سے راقم کے سرسری تعلقات تھے۔ وہ زندہ تھے تو ان کی زندگی ہی میں شعرِ اقبال کی ان آوارگیوں پر راقم نے احتجاج کیا تھا۔ اور وہ احتجاج شدید تھا۔ اب وہ حملت کر چکے ہیں تو اس جائزہ میں وہ شدت و حدت نہیں، صرف ان کے فلم کی اہانت طرزی کا احتساب کیا اور ان کی کھنڈری طبیعت کے شریز راویوں کا جائزہ لیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے ”فکرِ اقبال“ کے دریچوں میں اپنے خیالوں کی شمعیں جلاتی ہیں۔ اس سے متعلق سر آغاز میں کچھ بخنا عبّث ہو گا۔ ان کے خیالوں کا تجزیہ آئندہ صفحات میں کمال و تمام درج ہے۔ قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ خلیفہ عبدالحکیم افکارِ اقبال سے کس حد تک مخلص تھے؟ جس طرح بعض عجی فہمانے اسلام کے دامن میں اسرائیلی پیوند لگا کر دین حقہ کو داغدار کیا، کچھ اسی طرح خلیفہ صاحب نے اقبال کے چہرہ افکار پر اپنے قلم کی چیکپ کے داعی چھوڑ دے گئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں ہر سہ فلمکاروں کے اقتباسات نہایت اختیاط سے نقل کیے ہیں اور اقبال کے حوالے ہی سے تردید و تصحیح کی ہے۔ راقم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی ہر لختہ اصلاح کے لیے تیار ہے۔

راقم کا غقیدہ ہے کہ ہر مُعنتِ اور ہر مُولف خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اگر وہ کسی شخصی یا نظری عناد کے تحت اپنے مندرجات میں بھوٹ بولتا ہے تو بارگاہ اینہ دی میں مجسم ہے۔ اقبال راقم کے ذہنی مرشد تھے۔ انہی کے روحاںی تصرفات کی تحریک پر محولہ کتابوں کے تاصحات کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں کہ راقم اپنے فرض سے کس حد تک عہدہ برآ ہوا، یا اُس کا فلم کجروں سہو کر کس چک کا شکار

مُہتوا ہے۔ بہر حال کتاب نذر قارئین ہے۔

دفتر چان

۸۔ اپریل

۱۹۴۳ء

شورش کاشمیری



پاکستان نے پچھلے تایس برس میں اقبال سے متعلق مختلف عنوانوں سے رشحاتِ قلم کا ایک ڈھیر لگایا ہے۔ بلاشبہ درجنوں کتابیں ہیں کہی ایک رسائل کے اقبال پر خصوصی شمارے ہیں، اقبال کے نام سے دو چار مجلے نکلتے رہے ہیں بعض و تقریبات اقبال کے مقابلتی مجموعے ہیں۔ اقبال کے مجموعہ ہاتھ خطوط ہیں "اقبال نامہ" (مجموعہ مکاتیب دو جلد) مرتبہ شیخ عطا اللہ ایم۔ اے شعبۃ معاشریات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سب سے ذیقیح ہے۔ دونوں جلدوں سے اقبال کے "سوانح و فکار" کی بہت سی کڑیاں مل جاتی ہیں، ان کے علاوہ بعض لوگوں نے اقبال کے اُن خطوط کو شائع کیا ہے جو ان کے نام علامہ نے کبھی لکھتے، لیکن ان میں سوانحی افکار کمتر ہیں اُن کی نوعیت بخی خطوط کی ہے، یا اُس زمانے کے مکاتیب ہیں، جب علامہ ذہنی سفر کے ابتدائی مرحلوں میں تھے، پہچرا پنی عدالت وغیرہ کے سلسلے میں خط و کتابت فرماتے تھے، بعض چیزیں فی الواقع مطابعہ اقبال کے لیے عمدہ ہیں لیکن معدودے چند۔ لیکن رشحاتِ قلم کے اس انبار میں بیشتر چیزیں جشو و زواب مدد ہیں۔ انہیں نہ تو "سوانح اقبال" کے صحیح خطوط قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اُن سے آفکار اقبال کی راہیں ملتی ہیں۔ جہاں تک اقبال کے فکری کردار کا تعلق ہے وہ پاکستان کی ان ننانوے فی صد کتابوں میں عنقا ہے کیوں؟ ایک الگ مبحث ہے لیکن ۱۔ اقبال پر قلم اٹھانے والوں میں ایک جماعت اُن لوگوں کی ہے جو ہم اقبال سے قادر ہیں۔ وہ اقبال کو زیادہ سے زیادہ ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ہمیں ہانتے کہ افکار اقبال کی "غایت" کیا ہے اور اُن کی دعوت کے مظہرات کیا ہیں؟

۲ - بعض لوگوں نے اقبال کو اپنی "نمود و محدث" کے لیے انتخاب کیا، کہ ان کے لیے بھی ایک راستہ تھا۔ اس کھیپ کے کچھ لوگ ابھی حیات ہیں۔ وہ اس راستے کے سوا اور کوئی جادہ و منزہ نہیں رکھتے۔

۳ - جن لوگوں نے پاکستان کے مختلف العہد حکمرانوں کی خواہشوں کے تابع اقبال پر خامہ فرمائی کی، انہوں نے اقبال سے متعلق نظری موضوعات کو جھپٹ کر بیرونی عین علم کی شمع روشن کی ہے، لیکن فی الواقعہ اقبال کی دعوتِ فکر کو سبوتاڑ کیا ہے۔ اس کی حراثت انسانوں کو منتقل کرنے کے بجائے اپنی بُروڈت کتابوں کے حوالے کی، اور اس قسم کے عنواؤں پر قلم اٹھایا ہے جو اقبال کی شاہراہ سفر کے بعض موڑ تھے۔ ان لوگوں نے دعوتِ اقبال کے مفسیرات کو بالا رادہ نظر انداز کیا۔ وہ اُن پر قلم اٹھاتے اور اُن کی تعبیر و تشریح کو موضوع بناتے تو حکمرانوں کے لیے ایک قومی مسئلہ سیاسی طوفان لے کر پیدا ہوتا اور وہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے ناہل تھے؟ ان میں بعض لوگ اس مراج کے لئے کہ اقبال کی فکر ہی سے متفق نہ تھے، ان لوگوں نے اقبال کو اجلا نہیں بلکہ دھیما کیا، اس کی بینا دوں کو لیسا پورتی میں گم کر دیا۔ اس گرفہ میں علم و نظر کے اعتبار سے جزوں کے نہیں شاخوں کے لوگ تھے، اور آج تک وہی پیش ہیں۔

۴ - ایک جماعت، ایں قلم کے خانوادہ میں اُن لوگوں کی ہے جو اشتہالیت و تہذیب کا ناقوس پھونکتے اور اسی غرض سے فکر اقبال کو بـ لطائفِ الحیل کندہ انتقاد پر زدج کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اقبال شاعر ہے، مفکر نہیں، وہ اقبال کی فکر کو تضاد و نزاع کا الزام دے کر بھیجا کرتے لیکن عوام کو مغالطہ دینے کے لیے اس کے عظیم شاعر ہونے کا وادر اچھیرتے ہیں، چونکہ پاکستان کی تاریخیں "افکارِ اقبال" سے ہوئی ہے اس لیے وہ اقبال سے انکار نہیں کر سکتے، لیکن اپنے اقرار کو ان کے شاعر ہونے تک محدود رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنی ایک عین قری شخصیت رکھتا ہے۔ اس کا دجد اُس ملک کی

فکری سرگزشت کا منظر ہوتا ہے۔ مثلاً یونان کے لیے "افلاطون" و "ارسطو" ہیں۔ فرانس کے لیے "والپیر" اور "رسو" ہیں، جرمنی کے لیے "گوتھے اور نلشنے" ہیں، روس کے لیے "مارکس" اور "ٹبلشیقی" ہیں۔ پاکستان کے لیے اقبال ہی کی واحد شخصیت ہے۔ پروفیسر آر بری کے الفاظ میں پاکستان میں اقبال نہ ہو تو دُو تک ایک صحرائی صحراء ہے۔ — پاکستان بنا تو اقبال اس کی فکری معراج تھا اور اُس کے افکار ہی مسلمانوں کی ذہنی بیداری کا سُنگ میل تھے۔ اقبال کے نام پر ایک علمی ادارے کی تاسیس قومی ضرورت تھی، اس بحث سے قطع نظر کہ فی الواقع اس قومی ضرورت کا احساس کیا گیا یا اقبال اکادمی وزیر اقبال سرکاری نرداخانہ کے اتفاقی حد تھے یا دوستانہ ملی بھگت کا نتیجہ تھے۔ بہر حال کراچی میں اقبال اکادمی اور لاہور میں نرم اقبال (معناؤ دنوں ہی اکادمیاں) قائم کی گئیں اور ان کی معرفت اقبالیات کا آغاز ہوا۔ یوم اقبال کو عُرس کی شکل دی گئی تصنیف و تالیف کا دُول ڈالا گیا، اور تدوین و تسویہ کی مخلبین جمیں ان اکادمیوں کی معرفت وہ لوگ سامنے آتے جو ہمہ وجدہ اقبال کے مردموں کی خصوصیتوں سے محروم تھے (الاما شاء اللہ)۔ ان میں کلام اقبال کی آب و تاب کاشتا نہیں تک نہ تھا۔ اگر ان اکادمیوں میں شمول سے پہلے وہ کوئی مُصنف، مُؤلف یا مرتب ہی ہوتے تو اقبال سے متعلق ان کا لڑی پھرستی نفس کا شکار نہ ہوتا اور نہ آنا ضعیف ہوتا۔

اکادمی کا فقط ایک تاریخ ساز شخصیت کے نام پر بنایا ہے۔ سب سے پہلے اس فقط یا اصطلاح کا استعمال افلاطون کے مدرسے پر ہوا۔ جس باغ میں مدرسہ قائم کیا گیا اس کا نام اقیدمس (ACADEMUS) ہے۔ اکادمی اقیدمس ہی کا اُرف نام ہے۔

کوئی تو سُورس تک یونان میں اکادمیوں کا زور بندھا رہا۔ جسی نہیں (JUSTINIAN) نے اس کی پساط اُٹھی، لیکن تو صدیوں کی طویل مدت میں بھی اکادمی کا مطلب کبھی ناشر یا مرتب ادارہ نہیں رہا۔ اکادمی کی حقیقی عظمت کا اندازہ فرانس کے حکران

لوئی چہارویں کی اکادمی (۱۶۳۵ء) سے ہو سکتا ہے، اُس نے پہلے پہل فرانس میں اکادمی کی بنیاد رکھی، تو اُس کے چالینگ ارکان مقرر کیے، اور یہ روایت دباؤں آج تک قائم ہے جب تک اسامی میں کوئی جگہ خالی نہ ہو، دوسرا اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اکثر ممتاز و منفرد اشخاص منتظر ہی رہے ہیں۔

دیسکارت DASCARTES PESCAL میسکل اور MOLIARE ROUSSIAU ANDRE GUIDE حسین نے ۱۹۴۸ء میں نوبل پرائز حاصل کی، اکادمی کی رکنیت نہ پاسکے۔

اکادمی علم و فضل اور تظیر و فکر کی جلوہ گاہ کا نام ہے، اس کے ارکان ملک و قوم کی ذہنی رہنمائی اور علمی توانائی کا باعث ہوتے اور اپنی تخلیقات سے قوم و ملک کے ادبی ورثے اور فکری سرمائے میں تسلسل قائم رکھتے ہیں۔ ایک ایسی اکادمی یا نرم جو کسی شخصیت کے نام سے مسحوب ہو وہ گویا اُس کے عصری فکر اور قومی عیقورتیت کے اعتراف و ابلاغ کا محور ہوتی ہے اسی طرح ایک بڑے آدمی کے سوانح قومی نیزت میں سچنگی پیدا کرتے اور اس کے افکار اجتماعی تجد و جہد کی سختیں وضع کرتے ہیں، اور سخت کے معنی میں مقصود و مطلوب۔

پاکستان میں اقبال اکادمی اور نرم اقبال کی پچھر فیصلہ مطبوعات ناکارہ ہیں یا قی پچیس^{۲۵} فیصلہ سوانح خطوط میں مددگار ہو سکتی ہیں لیکن ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے حتی ہیں۔

سوال مختصر ہے کہ اقبال نے چن موصوعات کی آرزو کی اور ان کے لیے عمر کے آخری سویں میں مفطر ہے اُن پرسی نے قلم اٹھایا؟ وہ لوگ جو اقبال کا رازداں کہلاتے ہیں فخر محسوس کرتے اور خود کو اقبالیات سے متعلق اتحاری گردانتے رہے اُنہوں نے اس سمت توجہ کی،

اور اقبال کی اساساتِ فکر سے متعلق ذہنی رہنمائی کے خطوط مدون کیے، کلام اقبال اور افکارِ اقبال کے تمام موضوع نمایاں ہیں۔ اُن کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اپنی فکر کے متعلق کہنے بیان دل پر، کس عمارت کی ایجادگی چاہتے تھے، لیکن اقبالیتین نے ”اقبال و حیدر آباد“ اور ”اقبال و بھوپال“ ہی کو سب سے اہم موضوع قرار دیا، یا عظیۃ یکم کے نام خطوط دھونڈ دیے کہ اقبال طالب علم تھے تو اُن کی ”حرانی چنانکہ افتادانی“ کے دور میں اُن کے قلم کا اب ایسا تھے۔ میاں محمد شفیع اقبال کے مرض الموت میں اُن کے خدمت گزار رہے۔ کوئی بیس سال پہلے انہوں نے علامہ کے وہ اشارات شائع کیے تھے جو اُن کے افکار کا بین السطور میں اور جن پر وہ قلم اٹھانے کے متنی تھے، اقبال کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ

ISLAM—As I understand it

کے زیر عنوان کتاب لکھیں۔ ایک دوسری جگہ اس کا نام (Introduction to the Study of Islam) ”تعارفِ مطالعہ اسلام“ لکھا ہے۔ لیکن کسی اقبالی مفکر نے اس کی ضرورت پر غور ہی نہیں کیا، اور نہ اشاراتِ اقبال میں سے کسی ضریع پر تحقیق فرمائی۔ ان اقبالیتین کی تالیفات و مقالات ان سے بکری خالی ہیں۔ اگر اشاراتِ اقبال ”ملحوظ ہوتے تو ممکن تھا پاکستان اُس سیاسی و عمرانی، اور معاشی و تہذیبی مجرمان کا شکا ہو کر اس حالت کو زہنچا جو اس کے لیے آج خطرناک قسم کا دماغی حاوی ہے۔

Thus Spoke Larathnese

حضرت علامہ نظری کی مشہور کتاب

”بِقُلْ زَرُدْشَت“ کے طرز پر بعض طبعی اور ما بعد اطبیعی حقائق و معارف پر در تھے، لیکن اس بارے میں آج تک کسی نے سوچا ہی نہیں۔ حالانکہ ”دانشور ان اقبال“ میں سے ایک دو کے سوانح نگاروں نے اپنے مدعیین کو اقبال کے بعد سب سے بڑا مفکر کہا، The book on unknown prophet.

تو تھے، لیکن اس بارے میں آج تک کسی نے سوچا ہی نہیں۔ ”دانشور ان اقبال“ میں سے ایک دو کے سوانح نگاروں نے اپنے مدعیین کو اقبال کے بعد سب سے بڑا مفکر کہا، سوال کسی ”تفاہل و تبتیح“ کا نہیں، ہر شخص اس روایت سے آگاہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مسعودی

نے "الجہاد فی الاسلام" لکھی تو علامہ نے اس کا مطالعہ فرمائ کر نہ صرف تائش و تحسین کی بلکہ مولانا کو مدعو کیا کہ وہ پنجاب میں اپنی تحریک کی نیو اٹھائیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا پورا طریقہ علامہ اقبال ہی کی حکیمانہ آرزو کا مرتع ہے، لیکن "دانشور ان اقبال" میں ہے اکثر و دبیشیر چونکہ سرکاری دسترخان کے خوشہ چین رہے ہیں اس لیے اُن میں انکار اقبال کی اس پر کسی جدوجہد کا حوصلہ ہی نہ تھا۔

اُن کے نزدیک اقبال پاکستان کا اکیدہ مک موضع ہے یا غافلگی سلسلہ ہے کہ اُس کا عُرس منا کر ذہنی تشقی محسوس کرتے اور قلم و زبان کی انگڑاتی لیتے ہیں۔

دانشور ان اقبال کی سرکاری کھیپ نے انہیں تائش باہمی کی نیو اٹھا کر آپس میں ایک دوسرے کی دستاز لگاڑش میں طرہ تائش ضرور ڈالا لیکن اصلًا افکار اقبال کو محروم کیا اور ان کے مطالب پر قاتلانہ جملے کیے ہیں۔ اگر یہ لوگ اُن سے مخلص ہوتے تو نہ اقبال کو منغربی افکار کی ترازو میں تولتے اور نہ اُن کے نظریات پر منغربی فلا مفہ کی خوشہ چینی کا النام دھرتے کہ اقبال کے بنیادی تصورات یورپی حکماء سے ماخوذ ہیں۔ علامہ اقبال مُنتشر قین کے متعلق پی تکی راتے رکھتے تھے کہ ہر مُنتشر ق کا علم و فضل وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو منغرب کے استعمار اور اس کی شہنشاہیت (سامراج) کے مطابق ہو۔ وہ ان مُنتشر قین کو استعمار پسندوں اور سیاست کا روں کا دست و بازو تصور کرتے تھے۔

(مکتوباتِ اقبال از سید نذیر نیازی صفحہ ۹۶)

کسی اقبالی نے کبھی مُنتشر قین کی اس ذہنیت کا جائز نہیں لیا، بلکہ اُن سے مُعزز ہیں۔ علامہ نے "قادیانیت" سے متعلق جو فاضلانہ مقالات حوالہ قلم کیے اُن میں کئی ایک کتابوں کے تجویزی خاکے ہیں لیکن ان پر کسی احتجاج دار اقبال نے توجہ نہیں کی۔ مثلاً مسئلہ جہاد سے متعلق اقبال چاہتے تھے کہ اس بارے میں تاریخ مرتب کی جاتے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد کن عناصر نے شرعی و اہمی حیلوں سے انگریزوں کی وفاداری کا حواز پیدا کیا۔

اسی طرح ان کے پیش نظر شعراتے عجم کے اُن تصوّرات کی تاریخ و تجزیہ کا موضوع رہا۔ جن تصوّرات کے تحت شعائرِ اسلام کی تردید و تفسیح کی گئی۔ لیکن اُن شعراتے کے کلام کی دلفری کا بخرا پسکھا نہ رہنی زہر کا احساس ہی نہیں ہونے دیتا۔ اس موضوع پر ایک عمرہ کتاب تیار ہو سکتی ہے اور اس کی ملی افادتیت سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن کسی دانشورِ اقبال کو اس کی توفیق نہیں ہوتی اور اس کے وجہ بھی دھکے چھپے نہیں کہ بشیر الدین شوراءں اقبال عجمی شہنشاہیت کی ناراضی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ وہ قصیدے کا مزاج لے کر پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال نے مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ اور اسلام کو عالمی وحدۃ کی حیثیت سے بالا کرنے کے لیے جس طریق پر سوچا، اُس کے تحت افکار و خیال کی اساس پر بہت سی کتابیں مرتب ہو سکتی تھیں۔ مثلاً "فیضانِ اقبال" کے سر آغاز میں راقم نے لکھا ہے:

- ۱ - عربی و عجمی اسلام کا موازنہ، اور اس کے اُن مُضمرات پر محاکمہ جو مضمرات عجمی اسلام کی بدولت ذہنی ابتلاء ہو کر سبِ عظیم کے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں۔
- ۲ - قرآن اور اسلام میں ہندی، یونانی اور ایرانی تخلیقات کی کافرہ ماٹیاں اور اُن کے نتائج۔

۳ - تصوف کی تاریخ، تصوف کی حقیقت، تصوف کے اثرات، تصوف کے نتائج، تصوف کے آثار، اور ان آثار کے عربی و عجمی ثمرات۔

۴ - سبِ عظیم کے مسلمانوں کی ادبی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی تحریکوں کا جائزہ اور ان کے ثابت و منفی پہلو۔

۵ - اقبال کی غایت اور دانشوروں کی اس سے بے خبری۔ جو لوگ مغربی افکار کا جواز اسلام کی تعلیمات سے پیدا کرتے یا اسلام کی صداقت کے لیے مغربی افکار سے استدلال لاتے ہیں وہ اجتہاد نہیں فساد پیدا کرتے ہیں۔

- ۶ - جدید علم الكلام، اُس کی تاریخ اور اُس کی خودرت۔
- ۷ - سرمایہ دارانہ نظام کے اُن نتائج کی تفصیلات، جن سے انسانی معاشرے میں سخت بے چینی اور حیجان پایا جاتا ہے، اس نظام کے باختوں مسلمان علماً محدثوں کی تباہی، مسلمان اقوام کی بربادی اور اس فہمی الحاد کا ظہور جس نے نئی فپڈیں مذہب سے برگشتلگی پیدا کی ہے۔
- ۸ - مسلمانوں کے سیاسی زوال کے فکری اسباب۔
- ۹ - کیا مذہب، فلسفہ اور سائنس باہمگر متحارب ہیں؟ ہر سہیں سے انسانی معاشرے کی بغایارکس پر رکھی جاسکتی ہے؟
- ۱۰ - اسلامی معاشرے کے زوال و انحطاط میں ملوكیت و ملائیت کا حصہ۔
- ۱۱ - مشرق و مغرب کی کشمکش کے محکمات و نتائج۔
- ۱۲ - وطنیت و قومیت کے نظریوں کا ظہور و فتوّر۔ یورپی اقوام کے تصادمات اور ایشیائی اقوام کے تصادمات۔
- ۱۳ - قاریانی نبوت کی استعمالی ضرورت کا پیش منظر اور اس کی تاریخ!
- فضیلاء اقبال کا ان مصنایں و مباحث سے گزری و فرار یا تو سرکاری مصلحتوں کا ہر سوں تھا۔ یا پھر وہ ان موضوعات کی تحقیقات کا ماذہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ اقبال کی تحریریوں میں ان مباحث سے متعلق اتنے جامع اشارے و کنائے موجود ہیں کہ ایک علمی طبیعت کے لیے کوئی ساخلاً باقی نہیں رہتا، اقبال کی مہاجاتِ فکر و حکیمی نہیں، ان پر قلم اٹھایا جانا تو مطالعہ اقبال کی دقتیں آسان ہوتیں اور ہم اُس غایت تک پہنچ جاتے جو اقبال کا نتھیا تے نکر تھا۔ ہم نے اقبال کو پاکستان کا مصوّر کہا کہ وہ اس کے نکڑی موسیس تھے لیکن اقبال کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے اور اُن کے سامنے اس ریاست کے بغایاری خط و خال کیا تھے اور مسلمانوں کی وحدت کے لیے اُن کا تصور راتی خاکہ کیا تھا۔

اور ان کے پیش نظر کس قسم کا معاشرہ تھا، اس معاشرے کی اساسات کیا تھیں، فضلاً نے اقبال نے اس بارے میں اغراض کیا یا احتساب، یا بھر جیا کہ عرض کیا، وہ ان کے فہم و تقدیم اور تشریح و تفسیر کی استطاعت ہی نہ رکھتے تھے۔

اقبال کی فکر کے عناصر ترکیبی کیا تھے؟ ان کے تجزیہ و تحلیل اور متحرکات و مضمونات پر ان دانشوروں میں سے کسی نے قلم نہیں لٹھایا، کسی نے فکر اقبال پر خامہ فرمائی کی تو اقبال کو یورپ میں گھما یا بھرا یا ہے حالانکہ اقبال کو محلہ تے اسلام کی ذہنی تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کی فکر اسلامی حکائی و معارف سے الگ کوتی و جود رکھتی ہے، اقبال کی فکر عصر حاضر کی یورپی تحریکوں کے خلاف مسلمان عبقری کا انتقاد و احتجاج ہے، لیکن "دانشور ان اقبال" نے جو خود یورپی تعلیمات کی پیداوار میں، پاکستان کی حد تک اقبال کو یورپی فکر سے مرعوب و متأثر گردان کر دی اُسلوب اختیار کیا جو اسلام کے نظر تیز جہاد کی تعلیم و تنسیخ کے لینے شرعاً نئے عجم کا شاعر ہا ہے مثلاً ہے

هزاری ز پتے شہادت اندر تگ و پوست

غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر از دوست

او روز قیامت ایں به رو کے ماند

ایں گشتر دشمن است داں گشته دوست

علامہ فرماتے تھے "یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ اور قابل تعریف

ہے لیکن جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خویصہ طریق اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اس زہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جس کے منہ سے لگا ہے وہ اس کو آپ حیات سمجھتا ہے۔

اقبال کے متعلق پاکستان کا اکادمی ادب جو سرکاری مطبع میں تیار ہوا ہے اقبال کی تعلیم و تنسیخ کا دلفریب کپوان ہے، عوام تو خیر خواص بھی کسی حد تک محسوس کرتے

ہیں کہ فصلاتے اقبال نے بڑی کدو کاوش کی ہے اور شاید ان کی معرفت وہ اقبال سے آشنا ہوئے
ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دانشوروں کے رشحاتِ فلم سے اقبال کی فکر کا آئینہ پاش پاش
ہوتا اور سوانحی چہرے پر برص کے داغ ابھرتے ہیں۔ ان لوگوں نے اقبال سے وہی معاملہ
کیا ہے جو کئی صدیوں سے اسلام کو درپیش ہے کہ یونانی عقلیات اور عربی تصورات کی سان
پر کسائی ہے۔ نتیجہ جو دین اصلًا پیغمبر نہیں تھا وہ معنا پیغمبر تر ہو چکا ہے۔ اور خواہی نخواہی
اُس پر اس طرز کی غمارتیں قائم کی گئی ہیں، جو بنیاد و مراجح کی روایت سے بھول جھلیاں ہیں۔

علامہ اقبال اول کے اسلام کی شخصیتوں پر تو رطب اللسان تھے اور ان سے
متعلق اُن کے کلام میں کئی تلمیحات پائی جاتی ہیں، لیکن بعض عصری شخصیتوں یا اپنے دور
سے دو یا تین صدی پہلے کی شخصیتوں پر بھی اُن کی نگاہِ الحسی رہی ہے، کسی اقبالی نے حضرت
محمد و افتخار نافعؒ کی تعلیمات پر کام نہیں کیا۔ شاہ ولی اللہ سے متعلق علماء نے فرمایا کہ «الہیات
اسلامیہ کا اُن کی ذات پر خالمه ہو گیا۔ مگر اقبال کے دہستان میں ان سے متعلق کوئی صدا
ہی نہیں۔ سید جمال الدین افغانی اور سید عبدالرب بندی سے متعلق، دانشور اقبال
مہربب ہیں۔ انہیں اقبال اور بابا تے اُردو تالیف کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے،
لیکن ان شخصیتوں سے متعلق اُن کے ہاں ایک سطربھی نہیں حالانکہ اقبال نے انہیں مسلمانوں کی
نشاۃ ثانیہ کا موت کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے ان دانشوروں نے اقبال سے
انصاف نہیں کیا بلکہ ان کی ایک بڑی کھیپ نے اس کی عظمت کو بالا را دہ زخم لگاتے
ہیں۔ اقبال پر معیاری و محلی کتابیں آج بھی ہندوستان ہی کے مسلمان ایل فلم کی تصانیف میں
اور اس کا اعتراف خود، اُن پاکستانی دانشوروں نے کیا ہے جو بزمِ خویش اقبال کے
بعد سب سے بڑے مُفکر تھے۔ مثلاً خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے فکر اقبال کی تہذیب میں تسلیم کیا ہے
کہ:

”میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ، نہایت بیخ اور نہایت

جامع ہیں، ڈاکٹر یوسف حسن خاں کی "روحِ اقبال" اور مولانا عبد السلام ندوی کی "اقبال کامل" ان دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور اس کی تعلیم کا کوئی سہلوا یا دکھائی نہیں دیتا جو محتاج تشریع اور تشریش شریعت باقی رہ گیا ہو۔ لیکن اقبال کے افکار میں اتنی گیرائی، اتنی پرواز اور اتنی وسعت ہے کہ ان کتابوں کے جامع ہونے کے باوجود دفرید تصنیف کے لیے کسی مخذالت کی ضرورت نہیں۔" (صفحہ ۱۰۰، ۹)

چنانچہ خلیفہ صاحب نے "فکرِ اقبال" کے زیر عنوان $\frac{۲۲۵}{۱۸}$ صفحات گھبیٹ ڈالے۔ اقبال سے متعلق عتیری نافع کتاب بھی ہندوستان ہی کے اسلامی مفکر مولانا ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ یہ کتاب پہلے عربی میں "روائع اقبال" کے نام سے دمشق دریورت میں شائع ہوئی۔ اب اس کا اردو ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں نے کیا ہے۔ فاضل مصنف نے اردو ترجمہ میں بعض اضافے اور ترجمہ میں کی ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ نے اس کا تقدیر لکھا ہے۔ کتاب کا ہن اشاعت ۳۷ء ۱۹۴۶ء ہے۔

خلیفہ عبد الحکیم زمده ہوتے تو اس کی غلطت کا اقرار کرتے اور جی ہی جی میں تسلیم کرتے کہ ان کی نرم اقبال محض سرکاری زیر اعتمانہ کی دوستانہ بندربانٹ کا فریغہ ہے فی الجملہ۔ ایک تبدیری صرف ہے جس کے پس منتظر میں کوئی علی لگن نہیں۔ اقبال کے فکر و شعر پر جن لوگوں نے ایک زمانہ میں کسی شخص کی وجہ سے جملے کیے ان کی مدافعت علی گڑھ ہی کے مایہ ناز پروفیسر آں احمد سرور نے کی۔ پیگانہ عصر پروفیسر رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ کے ایک دوسرے پروفیسر محمد عزیز نے اقبال سے متعلق جب کوئی مقالہ لکھا تو ایک بڑی کتاب کو محیط تھا، قاضی عبد الغفار نے اقبال سے متعلق دو قسم مقالے لکھے، ان میں بھمال و تمام اقبال کا آہنگ اور اس کی ترجمگ ہے، لیکن پاکستان کے مقالہ نگاروں میں کوئی شخص، رشید احمد صدیقی، قاضی عبد الغفار، آں احمد سرور اور پروفیسر عزیز احمد کا نشیل نہیں، اور وہ سوز و خلوص ہی ان کے پاس نہیں جو قدرت نے انہیں ولیعت کیا۔ اور جس کی بدولت رووحِ اقبال میں ڈوب کر اس کی تصویریں لکھنچے ہیں۔

"ذکرِ اقبال" (عبدالجید سالک)، "شعرِ اقبال" (رعاید علی عاید) اور "فکرِ اقبال" (خلیفہ عبدالحکیم) پاکستان کی تصنیفات ہیں، انہیں سرکاری اکادمی نبم اقبال لاہور نے شائع کیا۔ ان کے مصنف فی الواقعہ دانشوروں اقبال کا ہراول تھے۔ ان میں سے دو گاہے ماہے اقبال کے ہم صحبت رہے، لیکن ہر سہ دانشوروں نے اقبال پر کیا لکھا؟ آئندہ سطور میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے، ان کتابوں سے اقبال کی توضع ہوتی یا تغییریں؟ اس کا فیصلہ قارئین کے حوالہ پر ہے۔



ذِكْرِ اقْبَانْ

”ذکرِ اقبال“ مولانا عبدالجید سالک کے قلم سے علامہ اقبال کی سوانح غری ہے۔ ناشر
بزم اقبال زرینگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور، ساز ۱۸۵۲ء، صفحات ۲۹۶۔ سال اشتات

۱۹۵۵ عیسوی۔

مولانا سالک ایک باغ و بہار ادیب تھے۔ ان کے سیاسی خیالات سے قطع نظر ہیں
قلم پر قدرت حاصل تھی، ان کی سیرت میں کوئی ایجاد انہیں سے یہ محسوس ہو کہ وہ کسی
کو زخم لگانا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال سے انہیں ایک گونہ عقیدت تھی، ذکرِ اقبال کے عرض حال
میں لکھتے ہیں کہ ”چپیں برس تک انہیں خود بھی علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا۔“ اقبال کا ذکر
چھپتا تو ان کا ذکرہ نہایت تپاک سے کرتے۔ راقم نے ان سے بار بار عظیم معلومات حاصل
کیں۔ علامہ سے متعلق ان کے دل و دماغ میں اختراماتِ فائقہ تھے لیکن ذکرِ اقبال مرتب
کرتے وقت ان کا پُر بہار قلم حدودِ انشاد پھانڈ کیا اور بعض اُڑتی ہوتی روایتوں اور حکایتوں
کے ہو گئے جو ان کے دوستوں نے بیان کیں۔ اور انہیں سوانح میں شامل کر لیا۔ شاید ان کے
علم میں نہ تھا کہ بعض حلقوں نے اقبال کی سیرت داغدار کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے، اور
وہ اقبال کے حکیم الاقت ہونے کا تصور پاش پاش کرنا چاہتے ہیں۔ قادیانی اس مہم میں اندر خانہ
پیش پیش تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود سے مولانا سالک کا میل ملا پ تھا، مولانا کے والد قادریانی
تھے، اور سکا بھائی بھی قادریانی تھا غالباً اسی باعث مولانا قادریانیت سے متعلق مشدد نہ تھے
لیکن بھی محفلوں میں مزرا غلام احمد کی ”چسبیوں“ سے چھمار کرتے تعجب ہے کہ ذکرِ اقبال میں
میرزا کو بہار ادیا اور دو ایک مضمون کے باقی علامہ سے اس طرح منسوب کی ہیں، گویا ان کا علاقہ
فی الواقع سوانح اقبال سے ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال بِرِ عظیم میں اپنے دور کے عظیم مسلمان عبقروی تھے۔ مولانا سالک نے "یارانِ کہن" (مطبوعہ مکتبہ چان) میں مولانا ابوالکلام کے ذکر کو بھی مرزا سیت کی بالا سطہ مدافعت میں استعمال کیا، اپنے مختصر خلاکے میں لکھا کہ "مولانا حمزہ غلام احمد سے بننے کے لیے قادیانی گئے تھے اور ان کی رحلت پر امر ترس کے سہ روزہ" وکیل" میں تعریتی شندڑہ لکھا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تردید میں اپنے سید جوی پروفیسر محمد امبل خاں سے راقم کو خط لکھوا یا، ادھر مولانا سالک کسی مثابرے میں شرکت کے لیے دہلی گئے تو اس خلگی میں مولانا نے اُن سے ملاقات نہ کی۔ سالک نے لاہور پنج کرنفیٹ دار چان میں اس کی تصحیح کر دی، اب وہ تصحیح "یارانِ کہن" کے دوسرے ایڈیشن میں آچکی ہے۔ سوانح اقبال میں سالک کا نقطہ نظر اپنی آپ بنتی "سرگزشت" سے قطعاً مختلف ہے، اپنی سوانح عمری مشرقی انداز کی ہے لیکن اقبال کے سوانح حیات، مغربی انداز میں تحریر کیے ہیں کہ جب تک حب و تسب کی ہڈیاں توڑنے لیں مغرب کے سوانح تکاروں کو اپنے مدد و حین کے سوانح حیات ادھورے نجوس ہوتے ہیں۔

مولانا سالک نے صفحہ ۱ پر لکھا ہے کہ

"علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی، اور امام صاحب رامام علی الحنفی کے قبرستان میں دفن کیے گئے شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے"

شیخ عطا محمد کا "احمدی" ہونا مشہور ہے لیکن خاندان اقبال کی روایت ہے کہ اقبال کا برادر بزرگوار ہونے کے باوجود وہ علامہ کے ہاں آتے تو مرزہ غلام احمد کو زبان کے اڑنگے پر لاکر شخني دیتے اور اس کی خانہ سازی بوت پر تبریزی تو لئتے تھے۔ اگر وہ قادیانی ہوتے تو سالکوں بیسے شہر میں جو مدینۃ الاحرار تھا، اُن کا امام صاحب کے قبرستان میں دفن ہونا ممکن تھا، وہ ابتداء کسی وجہ سے قادیانی ہوتے تھے لیکن علامہ نے مرزائی امت سے متعلق اپنے محرکہ خیز مقالات لکھے، تو انہیں نے قادیانیت سے قوبہ کر لی اور مسلمان ہو گئے، البتہ اُن کے فرزند شیخ اعجاز احمد

ضرور قادریانی ہیں۔ لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ ان کی اہلیہ اور عیال، مرزاعلام احمد پر قہقہے لگاتے اور قادریانی امت کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔

• دوسری شادی کے ضمن میں مولانا ساک رنمطراز ہیں :

”چونکہ علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی تھی مطلعین نہ تھے اور صرف قوت و مصالحت کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اس لیے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہاں تھے۔ احباب میں ذکر ہوا تو شیخ گلاب دین دکیل نے موجود دروازے کے ایک کشیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی جو اس وقت دکٹور یا گر لز سکول میں ٹرچھتی تھی، جب بات پکی ہو گئی تو علامہ کے برادر نبرگ شیخ عطا محمد سیاکلوٹ سے آتے اور مرزاجلال الدین میاں شاہ نواز بیرونی، مولوی احمد دکیل اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر علامہ کا نکاح پڑھا گیا۔ اس موقع پر صرف نکاح ہٹواتھا خصتی عمل میں نہیں آتی تھی۔ نکاح ہو جانے کے بعد علامہ کے پاس چند گمنام خطوط پہنچے جن میں منکوحہ خاتون کے خلاف نامناسب شکایات لکھتی تھیں۔ علامہ سخت ضغطے میں پڑ گئے، دوستوں سے ذکر کیا، انہوں نے حالات کی چھان بین کا وعدہ کر لیا، ان حالات کی وجہ سے خصتی کا معاملہ غیر معین وقت تک ملتوی ہو گیا۔

علامہ اس زمانے میں بے حد ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ایک بیوی سے ان بن ہو گئی تھی، دوسری کے متعلق یہ حالات رومنما ہو گئے۔

علامہ نے تیری شادی لدھیانہ کے توکھا خاندان میں کی۔ اس دوران میں دوسری شادی کا معاملہ متعلق رہا، مولانا ساک رکھتے ہیں کہ کچھ مدت بعد یہ واقعات رومنا ہوتے۔

(۱) دکٹور یا گر لز سکول کی ہیڈ مدرس مس بوئس سے مرزاجلال الدین کی بیگم نے اُس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اُس نے اُس لڑکی کی بے حد تعریف کی اور اس کی ذہانت، طباعی اور نسلی کو بجدید سراہا۔“

(۲) "علامہ کے والد مرحوم نے جو بیجید پر بیز کار اور تقدیں بزرگ تھے استخارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ لڑکی بالکل پاکہ مامن ہے۔"

(۳) مرتضیٰ الجلال الدین اور دوسرے دوستوں نے اپنے مشیوں اور کارکنوں کے ذمہ سے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ گذرا کم خلود کا ذمہ دار بی بخش دکیل تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی اس کے بیرونی راستے سے ہو جاتے۔

(۴) "جب یہ امکناں ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اس بات پر بیجا فسوس ظاہر کیا کہ علامہ نے بہت ان پر تقیین کر دیا؛ اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ میرزا نکاح آپ سے ہو چکا ہے اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اسی حالت میں پُرہیزی زندگی بس کر کر دل گی اور روزِ قیامت آپ کی دامنگیر ہوں گی۔ آخر علامہ اس سیگم کو لانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہیں شبہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے مُبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہوا۔ انہوں نے مرتضیٰ الجلال الدین کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پُرچھ آؤ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوتی لیکن اگر آپ کے دل میں کہیں شبہ اور دشمنی ہے تو دوبارہ نکاح کر لیجیے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ کا نکاح اُس خاتون سے دوبارہ پُرچھا یا گیا۔ یہی خاتون جا فید اور منیرہ کی والدہ ہیں۔

اس کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف تھگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ساری زنگ رلیاں ختم ہو گئیں۔ یہ ۱۹۱۳ء کا دادا قعده ہے۔"

"اقبال معنوانِ شباب میں اپنے شہر کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی سمجھی ہی رہے تھہر کی سمجھی کبھی نہ بنتے۔ آج بھی ان کے بعض ایسے کہیں سال احباب موجود ہیں جو اُس گئے گذرے زمانہ کی زمینیں صھبتوں

کی یاد کر سینوں سے لگاتے ہوتے ہیں۔ نور اقبال نے اپنی ابتدائی نظریوں کو جھپٹ کی کمی کو شش نہیں کی۔ ان کے نام ہم شیں اس خصیقت کے گواہ ہیں۔

رہنو ز بخوبی کے آخر میں بحضور رحمتہ تعالیٰ میں عرضِ حال کرنے ہوتے ہوئے انقرات کرتے ہیں کہ میں مددوں عشقِ مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا۔ فرماتے ہیں

تمتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ موبایں ساختم

بادہ بامہ سیما یاں زدم بر چرانِ عاقیت داماں زدم

بر قہاگر دید گسیر د حاصلم رہنزاں بُردند کالاتے الٰم

ایں شراب از شیشه جانم نہ رخیت

ایں زدا سادا ز دامنم نہ رخیت“

(صفحہ ۷۴ تا ۱۷)

کیا یہ سوانح غُری ہے؟ وہ کیا چیز تھی جو اس کے بغیر تشنہ رہتی؟ یا ذکرِ اقبال اُدھوڑ رہتا؟ سوانح اس لیے مرتب کیے جاتے ہیں کہ دوسروں کے لیے نہونہ ہوں اور لوگ ان سے مختلف العنوان بالیڈگی حاصل کریں جس سوانح حیات میں کوئی سی افادیت نہیں، یا کوئی تاریخی پہلو نہیں، اور جو واقعہ بیان کیا ہے اُس میں کوئی سی خوبی یا حسن نہیں بلکہ زدم کا پہلو ہے اس کو سوانح میں درج کرنا کس منطق و استدلال کی رو سے جائز ہے، اور اس میں کوئی ٹراٹی ہے، اس قسم کے واقعات بہت سی زندگیوں کو پیش آتے اور وہ ان سانحات میں سے گزرتی ہیں، لیکن اسکے لیے شرقی سوانح حیات میں کوئی سی جگہ نہیں۔ اور نہ مشرقی ادب کے سوانح نگاروں نے ان حادثوں کو کسی رعایت سے کوئی جگہ دی ہے۔ علامہ اقبال نے دوسری شادی کی تو عفیفہ خاتون پر اقترا باندھا گیا لیکن آخر کار وہ جھوٹ چھٹ گی۔ مولانا ساکن نے اس کا ذکر کیپوں ضروری خیال کیا؟ واللہ اعلم۔

آخرستی پُرد کے لیے اس میں کیا ہے؟ إلَّا يَهُ كَهْ نَتَيْ پُودْعَنْفُوَانِ شَابَ مِنْ لَهُو وَلَعْبَ کی

زندگی بس کرنے کے لیے علامہ کے غنفوانِ شباب کو محبت بنالے اور اس خیال سے مطمئن ہو کر
غنفوانِ شباب میں معصیت کی راہبوں سے گز ناناگز برداشت ہے۔

محولہ بالا اقتباس میں سوانح حیات کی ادنی اسی رفتہ بھی نہیں ہے۔

یہ روایت کہ علامہ نے والدہ جاوید کو حرم میں لانے کے لیے مرزا جلال الدین کو حکیم
نور الدین خلیفہ اول کے پاس قاریان بھیجا کہ شرعی مسئلہ پُرچھ آؤ۔ پھر اس کی راستے کے مطابق
ایک مولوی صاحب کو بلا کر دوبارہ نکاح پڑھا گیا، بنطاہر ایک افسانہ ہی ہے۔ نہ جانے
اس کا واضح کون ہے؟ سالک صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ علامہ قادریانیت کے ازدواج
کا اعلان کر چکے ہیں، اور وہ قادریانی امت کو دائرة اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ اس روایت
کو اس تفصیل سے بیان کیا کہ بالواسطہ احمدیت کا "دفعہ" ہو گیا ہے، کیا لاہور میں تکونی
عالم دین نہ تھا۔ علامہ اس زمانے میں ہندوستان بھر کے چیدہ علماء سے خط و کتابت رکھتے
تھے، کیا ان سے نہ پُرچھ سکتے تھے، بالفرض علامہ اس زمانے میں مرزا شیخ کے خدوخال سے
ناواقف تھے اور تب انہیں مسلمانوں ہی میں شامل سمجھتے تھے لیکن اس معمولی سی بات کے لیے
اپنے ایک دوست کو حکیم نور الدین کے پاس قاریان بھیجنما محض شوخی تحریر ہے۔ اس کے حق میں
کوئی سی روایت یاد رکھتی نہیں۔ علامہ مسئلہ کی نوعیت خط لکھ کر دریافت کر سکتے تھے اور
اگر خط اس لیے نہ لکھا کہ اس میں رسماں کا پہلو تھا یا وہ شبکی محسوس کرتے تھے تو سالک صاحب
نے اس واقعے یا افسانہ کو لکھ کر علامہ کی دستارِ عزت میں کو نساطرہ نام کا ہے، اگر سالک صاحب
لیے "دوسری شادی" کا ذکر سوانح حیات کا لازمہ تھا تو چار فقروں میں بیان کر سکتے تھے، لیکن
انہوں نے اس کہانی کو کھپیلا کر سیرتِ اقبال کو سہیا کیا ہے۔ مولانا سالک نے خاندانِ اقبال اور
علامہ اقبال ہی سے مرزا غلام احمد، حکیم نور الدین یا اُن کی امت کا رشته نہیں ٹانکا بلکہ اُن کے
اُستاد شمس العلماء مسید میر حسن شاہ کے ضمن میں بھی مرزا غلام احمد و حکیم نور الدین سے ان کی ملاقات
کا ذکر کیا ہے کہ:

”شاہ صاحب کے داماد سید خورشید انور بخارضہ واقع بجا رہو گئے تو وہ انہیں قادیانی سے گئے تاکہ حکیم نور الدین سے علاج کرائیں، قادیانی پہنچ کر مسجد میں گئے اور اُس دریکے میں جا بیٹھے جہاں مزرا صاحب بیٹھتے تھے، لوگ اُن کو جانتے نہ تھے۔ انہوں نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا لیکن وہ پھر دریکے کے پاس ہی آبیٹھے، مزرا صاحب آتے تو سلام کا محمولی جواب دے کر بیٹھ گئے، اور متوجہ نہ ہوتے۔ شاہ صاحب نے کہا غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں، مزرا صاحب نے دیکھا تو بُری محبت اور تپاک سے ملے اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کو بلا کر کہا کہ شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھہرا د، دو باتوں کی خاص طور سے تاکید کی۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ہی صبح بھوک لگ جاتی ہے کیونکہ یہ عادتاً کافی بچ جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، اس لیے ان کی حسب خواہش صبح ہی صبح کھانا دے دیا جائے۔ دوسرے انہیں اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے دی جاتیں، ساتھ ہی کہا صبح چانتے میر ساتھ پیش، بہت خاطر تو اضع کی، اور جب شاہ صاحب والپس جانے لگے تو مزرا صاحب دو سیل تک یکے کے ساتھ ساتھ آتے۔ یکی مشک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب نے ایک طرف جا کر اُن کی باتیں سنیں، بعد میں متفصل معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوتیں، نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔“

(ذکرِ اقبال صفحہ ۲۲۸)

ساکھ صاحب مزارتیت کے معاملے میں اس قدر فیاض تھے کہ علامہ اقبال نے اس کے متعلق جو کچھ کہا اور جو قدم اٹھایا وہ تمام خدف کر دیا ہے۔ جہاں ذکر کیا ہے مفہوم اس کار اخْتِصار کے ساتھ۔ لیکن مزرا غلام احمد اور ان کے حواریوں کے لیے ان سوانح میں جگہ ضرور نکالی ہے، آخر اس واقعہ کا سوانح اقبال سے کیا تعلق ہے۔ ذکرِ اتنا تھا کہ شمس العُلماء میر حسن شاہ علامہ اقبال کے اُستاد تھے، اُن کے سوانحی حالات نہیں لکھے۔ اقبال کے شاگرد ہونے یا

بعض دوسرے معروف شاگردوں پر ان کے مظاہرات کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کے تواریخ جانے کا ذکر "شتر گربہ" کے طور پر چڑھا ہے۔ مرا صاحب نے شاہ صاحب سے علیحدگی میں باقی کی ہوئی گی، لیکن سالک صاحب کے لیے مسئلہ یہ تھا:

"معلوم نہ ہو سکا کیا باقی مہر تین شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔"

اب اس سے کیا اخذ کیا جاتے؟ کبھی اس طرح کے دادا می آپ میں بلیں اور معلوم نہ ہو کہ ان کے درمیان کیا باقی مہر تین، تو ظاہر ہے کہ اُس مظاہرات کا ذکر ان کی باری دوسرے کی منتقل سوانح عمری میں حشو محض ہو گا۔ گمان غالب ہے کہ سالک صاحب نے تایمِ احمدیت کو موادِ ہیا کرنے کے لیے اس قسم کے اخذ قائم کیے ہیں۔

سالک صاحب نے کبھی ان لوگوں کا نذکرہ احسن طریق سے نہیں کیا جو مزناحت کے خلاف تھے۔ مولانا ظفر علی خاں ان کے قلم کی شدید زردی میں رہے، حالانکہ اپنے صحافتی سفر کا آغاز سالک نے زمیندار سے کیا تھا اور مولانا کے دبتان صحافت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ مرا غلام احمد سے متعلق ان کا قلم ہمیشہ مختار رہا۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانحی تذکرے یا سوانحی خاکے میں مرا غلام احمد کا ذکر بلا خودت شامل کیا، واضح رہتے کہ تبریزم میں مسلمانوں کے سیاسی مکتب فکر دد تھے، ایک کے غلطیم ذہنی رہنمای اقبال تھے، دوسرے کے مولانا ابوالکلام آناد، سالک نے ان دونوں کو مرا غلام احمد کے آستانے پر حاضر کیا۔ پس منظر میں کیا تھا؟ اللہ تعالیٰ ہی علیم و حبیر ہیں۔

تبریزم کی آزادی کے بعد مرا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کی انگریز پرسنی اور کامیابی کا نذکرہ عام ہتا تو مرا صاحب کی صفاتی کے خیال سے ان کے پیروں نے مسلمانوں کی استخار و شمن شخصیتوں کے انگریز سے تعاون کی دریافت شروع کی حالانکہ قومی تحریک سے پہلے جنگ غلطیم اول کے دوران یعنی بیسیویں صدی کی دوسری دہائی تک برطانوی حکومت سے تھاں ایک استبدادی امر تھا، عجیب بات ہے کہ اُمتوں کے لیے محبوب قاطع بیسوں کا کردار ہوتا

ہے لیکن "قادیانی بنی کی امت نے شاعر مولانا کی گفتار کو اپنے بنی کے کردار کی محبت بنایا۔ مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" کی پیشانی پر ۱۹۱۴ء سے پہلے جب ان کے والد اس کے مالک دُمیر تھے، ذیل کا شعر درج ہوتا تھا:-

تم خیر خواہ دولت بر طانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصرِ مہد اپنا جان شار

مرزا شیوں نے چرچا کیا کہ ظفر علی خاں مرزا صاحب پر کاسہ لیسی کا النام دھرتے ہیں لیکن ان کے اپنے اخبار کی پیشانی پر مذکورہ شعر لکھا ہوتا تھا۔

علامہ اقبال سے متعلق قادیانی امت نے سالک سے روایت حاصل کی جو اس کے جعلیں ابہانہ لڑی پر میں نقل کی جاتی ہے۔ ذکر اقبال میں سالک رقمطرانہ ہیں کہ:

"مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خاں اور
پیشوار دوسرے علمبرداران اتحاد اسلامی قید و بند میں تھے اگر علامہ اس فور
میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکام وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی اشد شدید
گرفت میں آ جاتے اور کوئی نتیجہ بھی مُرتَب نہ ہوتا بلکہ جب اداخر جنگ میں اُرٹے
نے دہلی میں وارک انفرس منعقد کی تو بطورِ خاص نواب دوالفقار علی خاں کی ملت
سے علامہ اقبال کو بھی مطلب کیا اور اس موقع کے لیے ایک نظم کی فرمائی
کی۔ علامہ نے مجبور ہو کر ایک مُستد س لکھی جس کے کل نو بند تھے۔ بطورِ نمونہ دو
بند ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ نظم دینیورسٹی ہال لاہور میں پڑھی گئی۔

آتے ماجدارِ خطا میخت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خادران ہند
محکم ترے قلم سے تظام جہاں ہند
ہنگامہ دفا میں مراسم قبول ہو
اہلِ دفا کی نذرِ محظوظ قبول ہو

تموار تری دہر میں نقاد خیر دشیر
بے روز جنگ تو ز، جگ سوز بینہ د
راست تری سپاہ کا سرایا نی طفر آزادہ، پر کشادہ پری زادہ یہم پسپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذریت کا آفتاب سے اُونچا مقام ہے

(ذکرِ اقبال صفحہ ۸۷)

اسی کتاب کے صفحہ ۹۰ پر جلسہ فتح اور اقبال کے زیرِ عنوان سالک صاحب لکھتے ہیں:

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگِ عظیم ختم ہوتی، جرمن، آسٹریا اور
ترکی شکست کھا گئے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو سراسریکل اُڈ وائز لیفٹنٹ گورنر پنجاب
نے بریڈ لاہال میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علامہ اقبال بھی نواب و الفقار
علی خاں کے ساتھ شرکیے ہوتے اور لاث صاحب کی فرمائش پر دو میں جھپوٹی جھپوٹی
نظمیں ارشاد فرماتیں۔

سراسریکل اُڈ وائز انگریزی فرمازروالی میں پنجاب کا سب بے مُنتبد گورنر تھا، اُس نے
پنجاب میں مارشل لاد بگایا اور جدیا نوالہ باع امر تسرکر کو انسانی خون سے لالہ زار کرایا تھا وہ ہندوستان
کی آزادی اور مسلمانوں کے وجود سے ہمیشہ مُتنفس رہا۔ اُس کے نزدیک هفت قاریانی ہی مُعتمد
مسلمان تھے — سالک صاحب کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے ترکی کی شکست اور برطانیہ کی
فتح کے اس جلسے میں جو سراسریکل اُڈ وائز کی صدارت میں منعقد ہوا، اقبال کی شرکت اُن کے
سوائیج میں درج کی، گویا اس کے بغیر ذکرِ اقبال ناپس رہتا اور سوانح مکمل نہ ہوتے، اقبال
کے سوانح حیات اسی کا نام ہے تو معلوم ہوتا ہے سالک صاحب نے کسی خلاء کی تشقی کے
لیے انہیں سینت سینت کر رکھا تھا، اقبال حلقت کر گئے، ملک آزاد ہو گیا۔ اس جلسے کو ۳۸
برس ہو گئے تو سالک نے پاکستان کی آزاد نسلوں کو آگاہ کیا، کہ تمہارا "فقرِ خیور" بھی اُس قادری
میں گلگشت کر جا ہے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے
نااطقہ سرگیریاں ہے اسے کیا کہیے

علامہ کی سب سے بڑی نشری تحریر، تکمیل حیدریہ الہیات اسلامیہ کے خطبات ہیں، ان خطبات سے وہ عمر کے آخری دور میں مطمئن نہیں تھے، فرماتے ہیں: علم بہت آگے بڑھ چکا ہے چونکہ انسانی فکر نے بہت سی راہیں ڈھونڈھلی ہیں لہذا خطبات نظر ثانی کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد علامہ کی سب سے بڑی نشری تحریر، قادریانیت سے متعلق ہے۔ اور اس بارے میں علامہ نے آخر تک کوئی ترمیم نہیں کی۔ پڑت جاہر لال نہروں کے جواب میں جو کچھ لکھایا اس سے پہلے قادریانیوں کو مسلمانوں سے اگر اقلیت قرار دینے کے متعلق جواب دیا، اور کتنی اخباری سوالات کی وجہات جن پرستے تک الفاظ میں دیتے دہ سب ان کی تحریریں کا حرف آخر میں سالک صاحب نے ان علمی بیانوں کا ذکر ایک صفحے سے زیادہ نہیں کیا۔

فرماتے ہیں:

«خدا جانے علامہ اقبال نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا جس میں یہ بتایا کہ اس فرقے راحمدیت، کی بنیاد ہی غلطی پر ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کیے اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔

علامہ نے انتہائی اشتعال و ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت امام جماعت احمدیہ، اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا، بلکہ اپنے خیالات کے انہمار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا۔»

(صفحہ ۲۱۰)

سالک صاحب کی ذہنی اپیچ ہے کہ انہوں نے قادریانیت سے متعلق علامہ کے خیالات کو "خدا جانے کس عقیدت مند کی درخواست" قرار دیا ہے۔ قادریانیت کی بنیاد علامہ نے غلطی پر

نہیں لکھی بلکہ اپنے مقالے کے میں اسٹوپر میں برطانوی استعمار کی تخلیقی قرار دیا، اسلام سے غداری پر مجموع کیا اور اس کا تجزیہ مستقبل میں ایک طاقتو قلم کے حوالے کیا ہے۔

ساکھ صاحب نے سوانح کے ضمن میں بعض سرسری واقعات بھی رقم کیے ہیں لیکن حضرت علامہ نے کشمیر کشمیری سے جس اساس پر استغفار دیا اُس کا رُخ ہی پھیر دیا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ علامہ کشمیر کشمیری سے قادریانی اُمت کی دینیہ کاری کے باعث الگ ہوتے تھے اسی طرح ساکھ صاحب نے انہیں حمایت اسلام سے مزائی اُمت کے نکالے جانے کا ذکر بھی نہیں کیا کہ علامہ نے اُس وقت تک اجلاس بھی نہ ہونے دیا جب تک ڈاکٹر مزايعة قوب بیگ کو اجلاس سے اٹھا کر رخصت نہ کیا۔ قادریانی اُمت سے متعلق ساکھ صاحب کی اس فیاضی کا سبب کیا ہے کہ ان کے والد قادریانی المذہب تھے، ان کے بھائی بھی قادریانی تھے اور وہ خود بھی مزا بشیر الدین محمود سے ملتے ملاتے تھے۔

تاریخ الحدیث جلد مقتدم مؤلفہ دوست محمد شاہزادہ ادارۃ المحتفین دبوہ نے ۱۹۶۷ء میں شائع کی، اس کے صفحہ ۲۳۰ پر عبد الجید ساکھ کے ایک خط کا عکس ہے جو مزا بشیر الدین محمود کے نام لکھا تھا، اس میں لکھا ہے:

محترمی حضرت قبلہ۔ السلام علیکم درحمۃ اللہ

”چندی ساعتیں میں نے قادریان میں گزاریں آپ کی برکت سے بے حد سرت
و اطمینان سے بیس روپیں، مولوی عبد الوہاب عمر، عبد العزیز خاں صاحب، شاکر
صاحب نے میری خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا، افسوس ہے کہ میں
بوقت رخصت آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا اس لیے کہ آپ مجلسِ شوریٰ
میں مصروف تھے۔ ہر صاحب کی طرف سے سلام منور۔“

عبد الجید ساکھ

الرقمبر ۱۹۵۶ء کو (ذکرِ اقبال کی اشاعت کے بعد) ساکھ صاحب نے دبوہ میں

تعلیمِ اسلام کا بح کے متعلق لکھا کہ:

”تعلیمِ اسلام کا بح احمدی جماعت اور پپل میان ناصر احمد کی مختصات
مساعی اور شبانہ روز مختت کا ایک عظیم الشان سمجھہ ہے۔ اس کا بح کے کارکن
جماعت کے تعمیری و تعلیمی تصوّرات کی تکمیل میں سہہرہ تن مصروف ہیں اور میرے
نزدیک ایک ایسی درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور برکت یہ ہے کہ
رببرہ کی فضما آج کل کی شہری آلو گیوں سے قطعی طور پر محفوظ ہے اور وہ
زرغیات بالکل مفقود ہیں جو تربیتِ اخلاقی میں حائل ہو کر تعلیم کے بلند تصوّرات
کو برپا کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس درسگاہ کو پاکستانیوں کے لیے زیادہ نے یاد
مفید و بارکت بناتے اور اس کے کارپروڈازوں کو بیش از بیش سمحی و حجد و حمد
کی توفیقی عطا فرماتے۔

عبدالجبار سالک

بلده - ۱۱ اگریوئی ۱۹۵۶ء۔

ذمایخ احمدیت جلد دهم صفحہ ۱۴۱-۱۴۲ (۱۹۵۶)

واضح رہے کہ ”ذکرِ اقبال“ اور ”محولہ آفیاس“ پنجاب کی خلاف قادیانی تحریک ۱۹۵۳ء کے بعد کی تحریریں میں مسلمانوں کا فیصلہ دلوک تھا کہ وہ قادیانی امت کو ملتِ اسلامیہ میں شامل نہیں کرتے اور دائرة اسلام سے خارج گردانتے ہیں۔ مرزابشیر الدین محمود نے اس کے فوراً بعد اپنی مدافعت کے لیے مسلمان اکابر کے تذکروں میں پیاہ لینیا شروع کی اور اس غرض سے اُن اپل قلم کو تلاش کیا جو اپنے قلم کی معرفت مسلمانوں میں قادیانی امت کے لیے راہ ہوا کر سکیں۔ ”ذکرِ اقبال“ اس رعایت سے ایک مدافعتی شہ پارہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کہی ایک سیاسی غلطیاں ہیں۔ مثلاً ”یونیٹ پارٹی اور مسلم لیگ“ کے زیر یعنوان صفحہ

۲۰۳ پر لکھا ہے کہ:

”یونیٹ پارٹی ہندو مسلمان، سکھ زمینداروں کی مخلوط پارٹی تھی، اور

اس کی وجہ سے شہری و دینیاتی حلقوں اگلے بڑے تھے لیکن علامہ اس طرزِ سیاست کے افادی پہلو کو پس لپشت ڈال کر یہ مثالی عقیدہ اپنے سامنے رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت سے کوئی مفاہمت کرنے کی ضرورت نہیں اور طبقات و درجات کی تقسیم غیر اسلامی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یونیورسٹ پارٹی پنجاب کی بہترین سیاسی پارٹی تھی۔ خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے۔ گویا علامہ اقبال کا سُوْعِ تدبر پر تھا کہ وہ یونیورسٹ پارٹی کے افادی پہلو کو پس لپشت ڈال کر پنجاب کی اس بہترین سیاسی پارٹی پر مسلم لیگ کی بالادستی قائم کرنا چاہتے تھے۔

فی الجملہ سالک صاحب نے سوانح اقبال اس طرح مرتب کیے ہیں کہ اقبال کی عملت کا میتاز قائم نہیں رہتا، اس میں بہت سی دراڑیں یا خلل محسوس ہوتے ہیں۔ سالک جہاں ان کے سوانح کا ذکر کرتے دیاں اس انداز سے قلم لگاتے ہیں کہ علامہ کی شخصیت اہم و لعب سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور جہاں ان کے افکار کا ضمناً تذکرہ کیا ہے وہاں مہدوؤں سے متعلق ان کی مفارکت کھل کر لکھی ہے۔ گاندھی و نہرو پر ٹنریں کی ہیں اور وہ مسلمان جو انہیں نیشنل کانگرس کے ساتھ تھے، انہیں بھی نیشنل ہونے کے جرم میں رکیدا ہے، لیکن رجست پند سرکاری مسلمانوں کا ذکر احترام سے کیا اور ان کی کاسہ لیسی کو مخفی رکھا ہے، قادر یا نیت کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا علامہ اقبال نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا وہ براہمہ کسی عقیدت مند کی درخواست پر تھا، ان کے اپنے مطالعہ و تجزیہ اور "غور و فکر" کا حاصل نہیں تھا ورنہ ان کے پڑے بھائی شیخ عطاء محمد قادریانی العقیدہ تھے اور والدہ جاوید کے متعلق علامہ کی بدگانی رفع ہو گئی تو ازدواجی زندگی قائم کرنے کے لیے حکیم نور الدین رحلیفہ اول (سے شرعی مشکل دریافت کیا۔ پھر انہی کے حسب مشورہ عمل کیا۔

حضرت علامہ نے یہ کہیں نہیں کہا کہ قادریانی امت کی بنیاد غلطی پر ہے، انہوں نے

اس کی بنیادِ اسلام سے "غداری" قرار دی ہے۔ غداری کو غلطی کہنا قلم کی اچھوتوں بانگی ہے۔
 المختصر ذکرِ اقبال کتی آیک غلطیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سالک کے بہار آفرین قلم کی سب سے
 بڑی غلطی ہے۔

شِرْأَقْبَانْ



”شعرِ اقبال“ عابدِ علی عابد کے قلم سے علامہ اقبال کی شاعری پر ایک مطالعاتی کتاب ہے۔
بے قولِ مؤلف اقبال کے شعورِ تخلیق کا جائزہ!

بزمِ اقبال کے دوستانہ طائفے نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ فی صفحہ کے حساب سے
کتاب کی اُجہت لیتے اور اس طرح سرکاری زراغانہ کی بندوباست کرتے تھے۔ تیجہ ہر مؤلف
مصنف یا مرتب کتاب کو زیادہ ضخیم کرتا اور ڈیا سپ کی ترتیب کو کھلا رکھو تو، کہ
اس طرح زیادہ سے زیادہ رقم پا سکے۔ عابدِ علی نے معاوضہ و صہول کرنے کا پورا انتہام کیا۔
شعرِ اقبال $\frac{۲۲}{۱۸}$ سائز کے ۲۴ صفحات ہیں۔ ایک دوسری کتاب ”تلہجات اقبال“
بھی اُن کے قلم سے اسی طرح کا ایک کھڑاگ ہے۔

عبدِ علی شعرِ اقبال کو مختصر کر سکتے تھے اس طرح کتاب جامع ہوتی اور شاید اقبال کے شعورِ
تخلیق کا جائزہ بھی۔ لیکن انہوں نے پیسے کے لیے کتاب لکھی تیجہ رطب و مالبس جمع کیا اور اس
طرح کتاب محفوظ ہو گئی۔ عابد صاحب نے اکٹھ صفحے پس منتظر کی سلطیت میں ضائع کیئے
اگر پس منتظر ضروری تھا تو اس سائز ہی کے پانچ چھ صفحوں میں نہایت جامع طور پر آسکتا تھا۔
اس کے بعد ۶۵ سے ۲۳ صفحات تک ابتدائی تعلیم و تربیت، محفلِ احباب، اور داع و شاعری
کی روایت کا انل بے جو مغمون لکھا ہے جو قرطاس و قلم کی آنکھ مچھلی ہے، اس کے بعض مندرجات
حد درجہ افسوسناک ہیں۔

عبدِ علی عابد شاید اپنے بارے میں وہ گوارا نہ کرتے جو داع کے متعلق لکھا ہے تیرا حصہ
ابتدائی عواملِ تخلیق اور اُن کے اثرات پر ہے جو ایکسا کتاب میں صفحے سے شروع ہوتا اور ۲۱۰ صفحے
پر ختم ہوتا ہے، اقبال زندہ ہوتے تو سر پڑتے یعنی۔ انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔

من آے میرِ ام^۳ دار از تو خواہیم
مرا یار اغزلخوانے شمردند

جزء دوم میں اقبال کے سفر لوریپ اور فکری انقلاب کی رواداد ہے۔ عابد نے وہی سلسلہ اختیار کیا ہے، جو ان کے یہے اعادہ ثباب کا موجب رہا ہے۔ یہ حصہ ۲۱۳ صفحہ سے ۳۶۰ صفحے تک پھیلا ہوا ہے، اور محض الفاظ کی شعیدہ بازی ہے۔ عابد نے اقبال کو اس باب میں عطیہ فیضی کے سپرد کیا، اور قلم سے اُبکامیاں لی ہیں۔ فرماتے ہیں:

”اقبال کی روشن تخلیق عطیہ فیضی کی شخصیت در رفاقت سے متاثر ہوئی،

متعدد موقعوں پر عطیہ کی طبیعتی و ذہانت اور احابت رائے اقبال کے کام آئی اور اقبال نے محسوس کیا کہ اس کی رفاقت کا میسر آجاناً معمتنات میں سے ہے۔“

یہ باب خیالات کی پچھنگی کا مجموعہ ہے، اور کوئی ساپھلو درست نہیں۔ جزء سوم کا خواہ ہے۔ ”اقبال کے شعور تخلیق کا ابلاغ والیہار“ صفحہ ۳۶۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۷۶ پر ختم ہوتا ہے۔ ان کے ضمنی عنوان ہیں:

مطابقت الفاظ و معانی، علامہ درموز، صفت گری!

عبد نے ایک تو کتاب کی ضمانت بڑھانے کے خیال سے اور دوسرے اپنے ذہنی خلادر کر پرکرنے کے لیے مختلف مصطفیوں اور شاروں کی تصنیفات کے طویل حوالے دے کر کتاب کی شکم پری کی ہے۔ چونکہ انتخابِ شعر کا انحصار ہر شخص کے انفرادی ذوق پر ہے، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے کلام اقبال سے جو شعر انتخاب کیے وہ کس حد تک حسب موضوع ہیں لیکن ان کا انتخاب سرسری ضرور ہے، جن حوالوں کے ساتھ انتخاب کیا گیا ان حوالوں کے تحت کلام اقبال میں اشعار کا بہترین ذخیرہ ہے اور ان میں متعلقہ مطالب کی عمیق روح پائی جاتی ہے۔ خرابی یہ ہے کہ عابد نے اقبال کے شعری ارتقاء کا تدریجی مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے جائزہ لینے کی خصوصیت سے محروم رہے ہے ہیں۔ وہ زیادہ تر ”بانگ درا“ پر انحصار کرتے ہیں اور

بانگ در اقبال کے شاعرانہ سفر کا آغاز ہے۔ بانگ درا میں اقبال فکر کے جادہ پر آچکے تھے لیکن فکر کی منزل میں نہیں تھے۔

عبد نے اس بارے میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں اس کی وجہ بھی ہے کہ وہ اقبال کے فکری ارتقا کے پر پیچ مرحلوں تک رسائی نہیں رکھتے تھے، چونکہ وہ عمر بھر مدرسے میں استادر ہے اس لیے انہوں نے قارئین کو طالب علم فرض کیا، اور مختلف حوالوں کی لیپا لپتی سے یہ کتاب الحیث ڈالی ہے۔ اُن کے سامنے اقبال کافن ہوتا تو ڈاکٹر یوسف حسن خاں کی "روح اقبال" سے مستفید ہوتے۔ روح اقبال نے الواقعہ روح اقبال ہے، فاضل مصنف نے اقبال کو اس حقیقتِ کبریٰ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ:

"اوپیاتِ عالم کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ایسی مثال ملے گی کہ کسی شاعرنے اقبال کی طرح اپنے دل آوز نہیں سے آنی پڑی جماعت پر جیسی کہ مسلمانوں ہند کی جماعت ہے، اتنا گہرا اثر چھپوڑا ہو"

(روح اقبال صفحہ ۱۳)

ڈاکٹر یوسف حسن نے دیا چے میں لکھا ہے کہ "کسی منفرد شاعر کے تصورِ حیات کو سمجھنا اور دوسروں کو سمجھنا مذہب رہی مشکل کام ہے"۔ اقبال وہ شاعر نہیں جس کا سلسلہ نسب عبد نے شاعری کے ردایتی خانوادے سے ملایا ہے۔ اقبال نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا سفر ضرور شروع کیا، لیکن شاعری محض سے جلد ہی با تھاٹھا لیا، البتہ اپنی فکر کو منطق کے بجائے شعر کی زبان میں پیش کیا کہ تب مسلمانوں کی ذہنی استعداد کو اس فکر میں ڈھلانے کے لیے اور کوئی لمحہ مزدوں نہ تھا۔ عبد علی نے اقبال کی صنعت گردی پر جن خیالات کا اظہار کیا وہ اُس شاعری کا حصہ ہیں جس کے متعلق اقبال محسوس کرتے تھے کہ اردو شاعری ہندوستان کے دوران خطاط کی پیداوار ہے اس لیے کمزور، غیر فطری اور حد در جم صنوعی ہے۔ (دانوار اقبال صفحہ ۲۵)

فرمایا :

”اُردو شعراء بھی اپنی قوم کے لیے فرحت مہیا کرتے ہیں۔ پرانے عربی شعراء بھی یہی کرتے تھے لیکن عربی شاعری اور اُردو شاعری میں وہی فرق ہے جو ایک سرفراز چنگو قوم اور ایک عترت زدہ قوم میں ہوتا ہے۔

(رانا بر اقبال صفحہ ۳۵)

اقبال صرف اُردو شعرا ہی کے متعلق یہ راتے نہیں رکھتے تھے، ان کے نزدیک عجمی شعراء کے تخیلیاتی رُگ و رشیہ میں زردشی زنگ تھا۔ (خطبہ مولوی انشاد اللہ خاں) چنانچہ مولوی سراج الدین پال کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

”ان شُعرا نے نہایت عجیب و غریب اور ظبا ہر دل فریب طرائقیں سے شعائرِ اسلام کی تردید و نسخ کی ہے۔“

اُدھر عابد علی نے جس آرٹ کو اقبال کے سرمنڈھنا چاہا وہ ان کے نزدیک ”ایک مقدس جھوٹ ہے۔“ (افکار پر پیش، ۲۰ راپریل ۱۹۱۰ء)

فرماتے :

”اُسلوبِ بیان کو شاعری کا خیقیقی (VIEW)، تصور کرنا کسی طرح

درست نہیں۔“ (خطبہ مولانا احمد سرور)

عابد نے ہن زوال پذیر روایوں کو اقبال کی اولیت فرار دیا اور ان کے شاعرانہ ازالہ افاد میں اُس سے تسلسل پیدا کیا، وہ اقبال کے نزدیک چنگیز خاں کی شکر کشی سے زیادہ تباہ گئی ہے۔ عابد اس خیقیقت کا احساس ہی نہیں کر سکے کہ :

”جب شاعر کا تخیل نجتہ ہو جاتا ہے تو اس سے ”تراؤشِ فکر“ نظری طور

پر شروع ہو جاتی ہے۔“ (زورِ حِ اقبال صفحہ ۲۳)

یہ ایک ایسا مبحث ہے کہ اس پر گفتگو کے بہت سے پہلوں میں عابد نے انہیں محسر ہی نہیں کیا۔ وہ خود ایک شاعر تھے اور ان کی شاعری میں انسانوں کے اجسام کا لئے

تھا وہ اس سے مختلف سوچ ہی نہ سکتے تھے اور نہ ان کی پرواز کے لیے کوئی دوسرا اُفُق تھا۔ اقبال نے عطیٰ یہ کے نام شروع کے ایک خط میں لکھا تھا کہ:

”میں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزو مند نہیں ہوں۔“

شرکت حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

”میری ہرگز خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعرا میں میر اشمار ہو۔“

(اقبال نامہ)

صالح محمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”آنے والی نسل کے قلب ان واردات سے بکسر خالی ہیں جن پر میرے افکار کی اساس ہے۔“

آل احمد سرور کو ایک خط میں لکھا کہ:

”میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ

ضروری ہے۔“

لیکن عابدِ علی کے نزدیک اقبال کو:

۱) عطیٰ یہ سیکم اور دیسے ہی زمین و سہم خیال لوگوں کی صحیح رفتاقت نصیب نہ ہوتی تو غالباً ان کی تخلیقی کاوشوں کی رفتار سُست پڑ جاتی۔ (صفحہ ۲۳۴)

۲) اقبال کے کلام میں تہائی کے احساس کا جو شدید اور خوبصورت اظہار

ہتا ہے، اس کا تجزیہ کرنے کے لیے اور اس کی اہمیت و نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ عطیٰ یہ سیکم کے روزناپچے اور اقبال کے ان کے نام خطوط کا تفصیل اور اتفاقاً جائزہ لیا جاتے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مستقل عنوان کے تحت اقبال کی زندگی کے اس حصے سے بحث کی جاتے جو عطیٰ یہ سیکم فیضی سے مربوط ہے کہ اس زمین و طرارِ خاتون کی رفتاقت نے صرف اقبال کی

تخلیقی کا وصول کو متاثر کیا ہے بلکہ اس کی روشنی کچھ نظر میں کا باعث بنتی ہے
صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اقبال کے کلام میں جذبے کے انہماں میں جتوڑا
ہے، وہ جو کچھ کھنچ رہنے کی خوبی ہے، وہ جو بات کھل کر نہ کرنے کی روشنی ہے
وہ جو دلی آہوں اور گھٹی گھٹی سانسوں کا سا عالم ہے) اس کا مصدر اور
نبع یہ خط مستقيم اقبال کی زندگی کا وہی حصہ ہے جو عطیہ سیکم فیضی سے متعلق
ہے۔ اگر اقبال کی ادبی اور تخلیقی کا وہیں عطیہ سیکم فیضی کی رفاقت سے غیر متاثر
رہتیں تو راقم السطور اقبال کی بخی زندگی کے اس پہلو سے قطع نظر کر سکتا تھا،
لیکن یہ انتہا درجہ کی بد دیانتی ہو گی اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ اقبال کی روشنی^{تخلیقی} عطیہ سیکم فیضی کی شخصیت اور رفاقت سے متاثر ہوتی ہے اس
متاثر کی اہمیت و نوعیت کا سراغ نہ لگایا جاتے۔“

(صفحہ ۲۳۱-۲۳۲)

عبد صاحب نے عطیہ کی رفاقت کے تحتانی حاشیہ میں دو شعر دیئے ہیں، ایک فارسی
دوسرا اردو — اردو شعر ہے —

گئے دن کہ تنہا تھا میں انہیں میں
یہاں اب مرے رازدار اور بھی ہیں

یہ بالِ جبریل سے مانوذ ہے اور بالِ جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی عطیہ سیکم طالب تھیں
اقبال طالب علم، ان کا "ساتھ" انگلینڈ اور جرمنی میں یکم اپریل، ۱۹۰۰ء سے ۳ ستمبر، ۱۹۰۸ء
تک رہا — کل پانچ ماہ، پھر اسی سال عطیہ سیکم واپس ہندوستان آگئیں۔ جون ۱۹۰۸ء
میں اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ دوبارہ یورپ گئیں تو اقبال سے ملاقات ہوتی۔ عطیہ سیکم نے
اپنی ڈاٹری دو ترجمہ فضیاء الدین احمد برلنی ناشر اقبال اکٹیڈمی کراچی، میں لکھا ہے کہ "میں ہندوستان
واپس آگئی تو اس کے بعد اقبال سے ملنے کا کوئی موقع نہ مل سکا"

عطیٰ بیگم کے نام کل دس خط ہیں اور وہ بھی ۱۹۱۱ء تک محوٰ شعر ۱۹۲۵ء کا ہے اور
بالِ جبریل میں ہے، لیکن عابد علی نے چوبیس برس پتھرے لوٹ کر محوٰ شعر کو عطیٰ بیگم کی رفاقت
بکے دامن میں ڈالا ہے۔ عطیٰ اپنی ڈائری میں رقمطراز ہیں کہ :

«اقبال کا تخلیق دنیا بھر کے دوسرے مصنفوں کے مقابلے میں بالکل اچھوتا
تھا اور میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس انتیاز کی بنیادی وجہ اس علم میں پھیر
ہے جو انہوں نے قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں
نے اپنے بہت سے خیالات کی بنیاد اس مقدس اور الہامی کتاب پر رکھی اور اسی
علم کی یادوں میں زیادہ شان پیدا ہو گئی۔»

لیکن عابد علی کے نزدیک کلام اقبال کا مصدر و غیرہ خط مستقيم عطیٰ بیگم فیضی کا مریون
ہے — اَنَا إِلَهٌ وَّاَنَا الْمَيْهَ رَاجِحُونَ۔

عبد علی کے نزدیک یہ امر بد دیانتی کے مترادفات تھا کہ اقبال کی بھی زندگی کے اس پیلوں
سے قطع نظر کرتے گویا شعر اقبال نامکمل رہ جاتی وہ اگر اس راز کا اکشاف نہ کرتے کہ اقبال
کی روشن تخلیق عطیٰ بیگم فیضی کی شخصیت و رفاقت سے متاثر ہوئی۔ — اقبال نے اپنے
ذہن کی نشوونما کو حن ہستیوں بوسٹر و بلاذرطہ مسووب کیا، وہ گویا اُن کا جھوٹ تھا، اصل حقیقت
کی شاندی تو عابد علی نے کی ہے، جرنی نفسہ شاعرانہ لغزشوں کی یادگار شخصیت تھے۔

علامہ کو داغ سے ثرف تکڑا کو، جو انہوں نے داغ سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا لیکن داغ
بہر حال اُن کے اُستاد تھے۔ اقبال نے بھروسہ مرثیے صرف تین ہی لکھے ہیں۔ ایک دالدہ مرحومہ کی
یاد میں جوانہ بائی ولگدا زمر شیہ ہے۔ اُس سے پہلے اُردو میں اس انداز کا کوئی مرثیہ نہیں، دوسرا
مرثیہ داغ کا ہے جو اُن کی خلعت کو خراج ہے۔ یہ دونوں مرثیے بانگ درا میں شامل ہیں تیرا
مرثیہ سید راس مسعود کا ہے جو ارمغان ججاز میں درج ہے۔ ان مرثیوں کے علاوہ مولانا گرامی
کا مرثیہ "انقلاب" لاہور میں اُن کی دفاتر پر شائع ہوا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر انگلتان

میں وفات پاگئے تو ان کی موت پر فارسی میں پانچ اشعار لکھے جو ریغیم کے بہت سے اخباروں نے صفحہ اول پر شائع کیے۔ لیکن گرامی وجہ بر کے مرثیے ان کی کسی کتاب میں نہیں۔ علامہ اقبال کے ابتدائی دورست سر شیخ عبدال قادر تھے۔ بانگ درا کا دیباچہ اُبھی کے قلم سے ہے۔ اقبال پہلے پہلے ان کے جریدہ "مخزن" بی کی معرفت سامنے آئے تھے، انہوں نے دیباچے میں علامہ کے داغ سے تلمذ کا ذکر چند سطروں میں ختم کیا اور لکھا ہے کہ:

"داغ کے سینکڑوں شاگرد ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے۔ شیخ صاحب نے بھی اُنہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زباندانی کے لیے اُن سے نسبت پیدا ہوئی، مگر اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں موجود نہ تھیں جن سے بعد انہاں کلام اقبال نے شہرت پائی، داغ نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ یہ سلسلہ تلمذ بہت دیر قائم نہیں ہا، لیکن اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔"

پروفیسر محمد طاہر فاروقی آگرہ کالج آگرہ میں شعبہ فارسی اور دو کے صدر تھے۔ انہوں نے بھی ایک عمدہ سیرت اقبال لکھی ہے اس میں "ابتدائی مشق" کے تحت لکھا ہے کہ:

"علامہ شروع میں خط و کتابت کے ذریعے داغ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔"

لیکن کوچھ غزلوں پر اصلاح کرنے کے بعد داغ نے اُن کو صاف صاف لکھ دیا کہ اب آپ کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔

مولانا عبد السلام ندوی نے "اقبالِ کامل" میں لکھا ہے کہ

"اقبال ۱۹۰۱ء سے پہلے زیادہ تر غزلیں لکھتے رہے، مزداداغ سے اصلاح لی، لیکن اُن کے مطبوعہ کلام میں داغ کے زنگ کی ایک آدھ غزل ہے۔"

پروفیسر عبدال قادر سروری کا خیال تھا کہ

"اقبال نے انتخاب کے وقت ایسی غزلیں خود چھانٹ دیں۔"

مولانا ساکن نے ذکرِ اقبال میں لکھا ہے کہ :

”اقبال نے سیاکوٹ کے زمانہ طالب علمی میں غزل لکھنی شروع کی اور خط و کتابت کے ذریعے فصیح المدک مرزا داغ سے چند غزلوں میں اصلاح لی۔

اس طرح اردو زباندانی کے لیے انہیں داغ سے نسبت پیدا ہوتی۔“

باقی عبد القادر کی ماتے نقل کی ہے لیکن عابد علی عابد نے ”شعر اقبال“ میں داغ کو شاید اس جرم میں رکیدا ہے کہ اقبال کے اُستاد تھے، اصل محبت شعر اقبال کے نشوون بلوغ اور اس کے تخلیل کی رفت و غلط کا ہے، لیکن عابد علی لکھتے ہیں :

(۱) داغ نے جس خاندان میں پر درش پائی وہ کسیوں اور طوائفوں کا ہے۔ انہیں اس پیشہ و رسم دلبڑی کے انداز دیکھنے کا شروع ہی سے موقع ملا ہو گا جو نیچی اور خریدی جاتی ہے۔

(۲) داغ جن اداویں کو اپنڈ کرتے ہیں ان میں لگاؤٹ، تصنیع اور تکلف زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گھر میں گھر کی عورتوں کو بھی لگاؤٹ، تصنیع اور تکلف کا دلدادہ دیکھا۔

(۳) انہوں نے مرتبے دم تک طوائفیں رکھ چھوڑی تھیں کہ شعر کہنے کی تحریک ہوتی رہے۔

(۴) داغ کی محبوبیہ (اگر ایسی عورت کو محبوبیہ کہہ سکتے ہیں)، قطعاً اور صریحاً طوائف ہے۔

(۵) اقبال نے یورپ جانے سے پہلے داغ سے اردو کی شعری روایت کے سارے رہنماییوں کے لیے تھے۔

(۶) داغ ادنیٰ واردات کو بعینہ پڑھنے والوں تک منتقل کرتے تھے، ان کی کیفیات ادنیٰ درجے کی تھیں۔

(۷) اقبال نے داغ کے کلام کا مطالعہ اس نظریہ سے کیا کہ شعری روایت

کی تمام میراث ان کے قبضے میں آ جاتے۔

(۸) داغ کے نانا یوسف سادہ کارو بی کے رہنے والے تھے، ان کے گھر کی تسام عورتیں اسی نسبت سے یوسف والیاں مشہور تھیں۔ داغ کی والدہ کا نام تحقیق معلوم نہیں ہو سکا۔ اکثر ذکر میں "چھوٹی بیگم" لکھا ہے جب ان کی شادی زراب شمس الدین احمد والی لوہارو سے ہوتی تو ممکن ہے یہ خطاب انہیں سُسرال سے ملا ہو، کیونکہ نواب کی پہلی بیوی موجود تھی، چھوٹی بیگم کی بہن عدہ خانم کا تعلق رام پور سے مسلم ہے۔ اسی تعلق کی بنابر، ۱۸۵۱ء کے بعد داغ رام پور پہنچے۔ تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا شمس الدین کے عقد میں آنے سے پہلے چھوٹی بیگم کا کسی اور سے تعلق رہا کہ نہیں؟ لیکن یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ خود نواب شمس الدین کے خاندان کے افراد نے داغ سے وہ مسلک نہیں کیا جو جائز اولاد سے کیا جاتا ہے۔ چھوٹی بیگم نے اس سلسلے میں کوئی قانونی چارہ جھنی بھی نہیں کی نواب شمس الدین ولیم فرزر کے الزام قتل میں چانسی پا گئے تو چھوٹی بیگم کچھ عرصے کے لیے خانہ نشین ہو گئی۔ پھر آغا شرآب علی سے نکاح کیا جس سے مزا شاغل پیدا ہوتے۔ قیاس چاہتا ہے کہ چھوٹی بیگم ۱۸۳۱ء کے لگ بجگ مزا فخر و (ولی عہد بہادر شاہ ظفر) کے نکاح میں آئیں، ان سے مزا خور شید عالم پیدا ہوتے۔ فخر کی رحلت کے بعد چھوٹی بیگم کا تعلق ایک انگریز مدرس طلبانی سے ہو گیا، جس سے ایک لڑکی بادشاہ بیگم پیدا ہوتی۔

(۹) داغ کی زندگی بہت سے الٰتے تملک میں بس رہی، ان کی ماں نہایت حسین، خوش وضع اور کافرا داناز نہیں تھی۔

رُتْبَيَّاتِ شِعْرِ اقبال صفحہ ۸ تا ۱۱۵)

عادل علی کی ایک دوسری کتاب "تلمیحاتِ اقبال" ہے۔ ناشر وہی نہم اقبال، سالِ شاعت

۱۹۵۹ء۔ اس کے صفحہ ۲ پر داع کے خاندان سے متعلق عابد اپنے فرمودات کا اعادہ کرتے ہوتے لکھتے ہیں کہ:

”داع کی ماں خانگی یا طوائف تھی، داع شمس الدین سے تعلق خاطر کا ثمر ہے۔“

عبد علی زندہ تھے تو راقم نے اُسی زمانے میں داع سے متعلق اُن کی اس ثاثر خانی پر ”چنان“ میں ایک تبصراتی مقالہ لکھ کر اخراج کیا اور اُن سے سوال کیا تھا کہ وہ اپنے متعلق اس انداز کی یا وہ گوئی سننے کے لیے تیار ہیں؟ راقم کا خیال ہے کہ اس طرز کی عیب بینی، عیب گوئی یا عیب تکاری وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے بارے میں اس طرز کے خلاف کاشکار ہوتے اور اُن کے خوب نسب کو دیکھ لگ چکی ہوتی ہے۔ حابدر حلقت فرمائچے ہیں اب اُن کا معاملہ اللہ کے پسروں ہے۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ اُن کی لغزشوں کو درگذر فرمائے اور انہیں بخش دے۔ ”شعرِ اقبال“ اُن کے نامہ ہو و لعب“ کی یادگار ہے۔

عبد بہبہ وجہ کثی حادثوں کا شکار تھے، اُن کا وجود سانحاتی تھا۔ ان کے حالاتِ نسلی صحیفہ کے عبد نمبر ۱۹۱۷ء جولائی، میں مشہور قادیانی اسمعیل پانی پی نے لکھے تھے گو حالات اس بھی فرد تر تھے لیکن رکھ رکھاؤ کے باوجود حقیقت اُبھر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

”عبد کے پرداد استیر جب علی شاہ قدیم دہلی کا بھی میں پر دیسر تھے، انگریزی حکام سے تعلقات پیدا کیے اور ۱۸۵۷ء میں محاصرہ دہلی کے وقت انگریزوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس صلے میں انہیں دس ہزار روپے کے لیے غصہ گورنر نیچاپ کے میرنشی مقرر ہوتے۔“

رجب علی قلعہ مُعلی کے اُن غداروں میں سے تھا جنہیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہادر شاہ ظفر کے خلاف خرید رکھا تھا اور وہ ان کی مخبری کرتے تھے۔ نواب شمس الدین والی لوہار دہلی

کی مخبری سے بچانی پر لمحاتے گتے، ان کی بدولت اس زمانے میں پنجاب و سرحد کے جہادی مسلمانوں پر جوستی وہ الگ داستان ہے۔ ممکن ہے عابدِ علی کے دل میں ایسی کلی خلاش ہو کہ داغِ دہلوی نے اُن کے پردادا کی غداریوں کا پردہ چاک کیا اور انہیں نواب شمس الدین کا بالاط قاتل قرار دیا تھا۔ عابد ایک عجوبہ روزگار انسان تھے۔ فرض کیجیے داغ طوائف کا بیٹا تھا لیکن غیرت مند تھا، عابدِ خود بھی اسی ٹھہنی کا تپا تھے۔ اُن کا زنگ ڈھنگ یہ رہا کہ بہت سی شرفاً زادیوں کو شاعری کے جال میں بچاننا اور مُعلّمی کے دام سے شکار کیا۔ بچہ اُن پر ایک مدت طبع آزمائی کی، آخر کار انہیں طوائف بنا دیا۔ قلم کو علیینٹ کرنا مناسب نہیں کہ عظیم گناہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عابد اپنے لیے ایک آئینہ تھا اور ہر چیز میں اپنا ہی چہرہ دیکھتا تھا۔ وہ ایک مدرس تھے اور انہیں مدرس ہی رہنا چاہیے تھا، لیکن نظم و نثر کی مختلف دادیوں میں قدم رکھا تو پاکستان بن جانے کے بعد اُن کے لہو و لعوب کا راہ ہوا رکھیٹ ہو گیا، اپنی اولاد سے دغا کی، اُن کے آگبھیوں کو توڑا، پیانوں میں ڈوب گئے، حتیٰ کہ اُن کا خون شراب ہو گیا۔ ان اللئے تلوں کے لیے انہیں روپیہ کی اشد ضرورت نے محصور کر رکھا تھا۔ پر سپلشپ سے محروم ہو گئے تو معاش کا ذریعہ صرف قلم رہ گیا۔ "شعرِ اقبال" مذکور ہے۔ اقبال نکھیں، اجرت پر تراجم کیے۔ غرض یہی چیزیں تھیں جن پر عمر کا آخری زمانہ پتاتے رہے۔ اُن کی مددوшی و بدستی کا یہ حال تھا کہ بعض کتابیں خود نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنے خامکا شاگردوں سے لکھواتے اور کئی ایک تراجم اُنہی سے کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طرزِ انشا میں میکانی نہیں، اور نہ کوئی مستقل اسلوبِ نگارش ہے۔ بعض ترجمے مُسرقہ ہیں۔ مثلاً "داستانِ فلسفہ" عثمانیہ یونیورسٹی کے ترجمہ کی چوری ہے۔ چند الفاظ میں اُنکے پھر کیا ہے۔

"شعرِ اقبال" — شروع سے آخر تک مرُبوط کتاب نہیں۔ ہر باب کا طرزِ نگارش جدا گانہ ہے۔

اقبال نے شاید ان سے متعلق ہی کہا تھا ہے
 نہ بینی خسیر ازان مردِ فروتہر
 کہ بر من تھہتِ شعر و سخن بست

فِكْرِ اقْبَانْ



فکرِ اقبال خلیفہ عبدالحکیم کے قلم سے ۱۸۶۵ء کے ۲۳ صفحات کی تجزیاتی کتاب ہے، جس میں اقبال کے فکر کا جائزہ لیا گیا، ان کے مأخذ تلاش کیے گئے اور کلامِ اقبال کی مختلف خصوصیتوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ خلیفہ صاحب نے اپنی تہذید میں ڈاکٹر یوسف حس خاں کی "روحِ اقبال" کے جامع و مانع اور فصیح و بلینغ ہرنے کا اقرار اٹھایا ہے لیکن ساتھ ہی لکھا ہے کہ "اقبال کے افکار میں اتنی گیرائی اتنی پرداز اور اتنی وسعت ہے کہ مزید تصنیف کے لیے کسی مدد رت کی ضرورت نہیں"۔ چنانچہ خلیفہ صاحب نے فکرِ اقبال کو موضوع کے اعتبار سے جامع تو نہیں کیا ضخیم ضرور کیا ہے اور آخری ۱۲۳ صفحات میں اشکیلِ حدید الہیات کا خلاصہ دے دیا ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے اس کتاب پر بیس ہزار روپے معاونت و صول کیا، جو اقبال سے متعلق یقیناً کسی مصنف یا مؤلف نے کبھی حاصل نہیں کیا۔ اس لحاظ سے خلیفہ صاحب سرفہرست اقبالی تھے۔ گوبنیم اقبال لاہور سرکاری ادارہ تھا، لیکن اس کے کرتا دھرم خلیفہ عبدالحکیم ہی تھے، خلیفہ صاحب قیام پاکستان کے ڈیڑھ دو سال بعد حیدر آباد سے سکد و شہر ہو کر لاہور پہنچے تو ملک غلام محمد دتب وزیرِ حزاۃ پھر گورنر جنرل ہے عہدِ ریاست کے دوستانہ تعلقات کی بنیا پر دولاٹ کی سالانہ اہدافے کے ادارہ ثقافت اسلامیہ اور بنیم اقبال قائم کی۔ ان کے تحت جو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پچھتر فی صد قلم کے اسراف پر سرکاری روپے کا سو عرب استعمال تھا۔

خلیفہ صاحب نے سب سے پہلے تحریکِ ختم نبوت (۱۹۵۳ء) کے زمانے میں اقبال کے نام سے کتاب بچہ لکھا، جس میں ملا کی آڑ کے کر اسلام کی بھجدا رائی، اقبال کے اشعار کی غلط توجیہیں کیں اور اس طرح ملعویات کا ایک پینڈہ تیار کیا۔ اس کتاب بچہ کے پس منتظر ہیں ایک تو حکومت کا لادینی طائفہ تھا، جس کا سرغناہ خود ملک غلام محمد لکھا، دوسرے اس میں قادیانی امت کی خواہشوں کا دخل تھا۔ مرزابشیر الدین خلیفہ صاحب کے ملاقاتی تھے ان کی سوانح عمری مصنفہ ممتاز اختر مرزاشائع کردہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے صفحہ ۲۷ پر جھپٹے لطیفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب عموماً ملک غلام محمد اور سرطفر اللہ خاں سے ملاقات کرتے اور راز و نیاز فرماتے تھے۔

اقبال کا ملاؤہ ہے جو دین کے فہم سے محروم ہے، لیکن ملا کہلاتا ہے۔ وہ ملا ہرگز نہیں، جس کی تاریخ مسندِ رسول کا صحیح دارث ہونے کے باعث قربانی و استفامت کی تاریخ ہے، خلیفہ صاحب نے دین کے ان عظیم نمائندوں کو اقبال کے ملائیں لیپیٹ کر، نہ صرف استہزا اسلام کا جرم کیا بلکہ روحِ اقبال کو بھی ناخوش کیا۔ اس کتاب بچہ کے بہت سے ایڈیشن شائع ہوتے، لیکن اس کی ایک بڑی تعداد تحریکِ ختم نبوت کے استبدادی زمانے میں حکومت نے منفعت تقسیم کی۔ دوسری بڑی تعدادِ ربوہ نے خرید کر قادیانی گاشتوں کی معرفت مختلف لوگوں کو ارسال کی۔ اس کی انفرادی خریداری پانچ فی صد سے نہیں بڑھی، اس کتاب بچہ کے متعلق یہ کہتا غلط نہ ہو گا کہ خلیفہ صاحب نے دینِ قیم سے تعلّب کیا، اور علماتِ حق کی اہانت کی۔

فکرِ اقبال متنبہ خیالات کے مختلف المعنی امارات کا مجموعہ ہے۔ کوئی مرکُوط کتاب نہیں۔ ہر باب کا موضوع الگ ہے۔ اول تو ایک ہی موضوع میں کئی تکمیرات ہیں، لیکن ہر باب میں دوسرے باب کی تغذیہ بھی ہے۔ خلیفہ صاحب کے سوانحِ نگارِ ممتاز اختر مرزا کے نزدیک:

”اقبال کے بعد خلیفہ صاحب کے فلسفہ و فکر کو دنیا تے اسلام میں اہم مقام حاصل ہے، اور ان کی ہمہ جبہت شخصیت فلسفہ، ادب، تاریخ اور مذہب غرضیکم علم و فنون کے بے شمار گوشوں پر چادی نظر آتی ہے۔“

لیکن خلیفہ صاحب کی یہ خصوصیت کہاں ہے؟ اور اقبال کے بعد انہیں یہ مقام کیونکر حاصل ہتا؟ ممتاز اخترنشان دبی فرماتے تو بہتر ہوتا، حقیقت بس اتنی ہے کہ خلیفہ صاحب نے حیدر آباد دکن کی ملازمت سے سبکدشی کے بعد لاہور میں سرکاری زراعتی کی سالانہ یافت سے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ اور برم اقبال قائم کیں اور اپنے وجود کی نمائش کے لیے ایک خود ساختہ قافلہ کے سرخیل ہو گئے۔ اقبال سے اُن کے مراسم کا طول و عرض کیا ہے؟ ایں ایں بنی کیا تو اپنے بزرگوں کی معرفت اقبال سے سفارشی خط لے کر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں لیکچرر ہو گئے۔ وہاں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۵ء تک ملازمت کی پھر رائیڈل برگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وظیفہ کے لیے ۱۹۳۳ء تک ملازمت کی۔ سری نگر سے امرنگھ کالج سری نگر کے پنسپل ہو کر گئے۔ اور ۱۹۳۴ء تک ملازمت کی۔ سری نگر سے حیدر آباد لوٹ کر ۱۹۳۹ء جون اعطا کی ملازمت رہے۔

قیامِ پاکستان کے دو سال بعد لاہور تشریف لاتے۔ اقبال سے اُن کا تعلق کب تھا؟ اگر اُن کے نام اقبال کا کوئی خط ہوتا تو وہ ضرور کسی مجموعے میں شامل کراتے یا خود چھاپتے اور اگر بہت سے خطوط ہوتے تو انہیں کتاب بنادیتے، لیکن راقم کے علم میں ایسا کوئی خط نہیں، البتہ علامہ اقبال کے فرزندِ احمدنگر جاوید اقبال کے پاس بہت سے خطوط محفوظ ہیں جو علامہ کے نام مختلف افراد لکھتے رہے، ان میں خلیفہ صاحب کے بھی دو چار خط ہیں۔ اُن میں خلیفہ صاحب نے خدا کی سنتی سے انکار کیا ہے۔ اور ایسی ہی بعض دوسری باتیں لکھی ہیں۔ اگر اقبال نے جواب دیا تھا تو لازماً ایسا ہو گا کہ خلیفہ صاحب شائع کرنے کا حوصلہ ہی نہ کر سکے ہوں۔ اگر جواب نہیں دیا تو ظاہر ہے کہ اقبال خلیفہ صاحب کو لائق اعتماد ہی

نہیں سمجھتے تھے۔ خلیفہ صاحب کے یہ پاکستان میں اپنے خیالوں پر زندگی گزارنا مشکل تھا۔ انہوں نے اقبال کا سہارا لے کر اپنی ذات کا نادیچوں کا معلوم ہوتا ہے خلیفہ صاحب شریعتیہ منجزی کا شکار تھے اور اُسی کا بدیجی نتیجہ اُن کی شریعتیہ بیانی ہے۔ وہ اقبال کے گُن گاتے، اور بُری اُد پھی سُردوں میں اس کی عظمت کا نغمہ چھپرتے ہیں، لیکن کلام اقبال کے عنابرِ خنسہ کی چھمار بھی کرتے ہیں۔ اُنہیں یا تو احساس ہی نہیں رہا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں یا اقبال کے فہم ذکر سے نامبلد تھے یا پھر اُس کی عظمت پر اپنی عظمت فائی کرنا چاہتے تھے۔

”اقبال اور ملا“ کے متعلق عرض کیا کہ ”مجموعہ خرافات“ ہے لیکن فکرِ اقبال کے مطابع سے

معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) اسلام کے متعلق ان کی معلومات سطحی تھیں۔

(۲) اُنہیں شاید قرونِ اولیٰ سے لہی بغض تھا، یا وہ اس دور کی عظمت ہی سے آگاہ نہیں تھے۔

(۳) یورپ کے مادی غلبے، اور فہمی بازی پر سے اُنہیں غایبت درجہ داشتگی تھی۔

(۴) اُنہیں علماء کے ادارے سے تنفس تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اُن پر بے نگام تبریزی بازی کی ہے۔

(۵) ایل صفات سے قلبی و قلمی عداوت رکھتے تھے۔

(۶) شاید نہیں جانتے تھے کہ سردرِ کائنات کا مقام ادب کیا ہے، اُن کا فلم بے احتیاط تھا، ہضوم کے تذکرے میں الفاظ کے چخاؤ کا اُنہیں سلیقہ ہی نہ تھا۔

(۷) یورپی دانش و تہذیب سے لگاؤ تھا، اور اس کے یہ احترام و اعتراض کے جذبات رکھتے تھے۔

(۸) غلط زبان لکھتے اور محاورہ دروزہ مژہ سے بیگانے تھے۔

(۹) کچھ میمع تعبیریں کرتے اور مریزی و بحدار قسم کا اسلوب رکھتے تھے۔

(۱۰) قدما کے اشعار میں الفاظ کا غیر ارادی حکم و احتفاظ فرماتے اور محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ اس موضوع پر کوئی لوگوں سے ہم کلام ہی۔

(۱۱) اقبال کی بصیرت پر فرنگی دانشوروں کی چھاپ لگاتے بغیر اقبال کے بنیادی تصورات کو تسلیم نہیں کیا۔

(۱۲) "نکر اقبال" میں اول تا آخر وحدتِ بیان کا فقدان ہے۔

(۱۳) انہیں اسلامیات سے رسمی شخخت تھا۔

(۱۴) اقبال کے افکار کی معنوی روح سے کاملاً بیگانہ رہے۔

(۱۵) انگریزوں کے دور سے ابلہانہ عشق تھا۔

(۱۶) اسلام کا تذکرہ بے ادبی سے کرتے۔

(۱۷) تمام کتاب فی الجبلہ با کہنے پر غیر ضروری اعتماد، لیکن بات نہ کہہ سکنے کے عجز کا شہ پارہ ہے۔

(۱۸) ان کی سیاسی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یا تو ان کے جیب و دامان خالی تھے یا ان معلومات کو حسب حال نہ پاک رجہ پ سادھیتے تھے۔

(۱۹) مطالعہ مشرق کی لطاقتوں سے محروم لیکن مطالعہ مغرب کی غلاتتوں میں تھرے ہوئے تھے، لیکن مغربی دانش سے ان کا دماغ سو ہی ہضم کا شکار تھا۔

پہلا باب، اقبال کی شاعری کے ارتقا تی منازل پر ہے، آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

"رائم کو علامہ کے والد شیخ نور محمد سے ملنے کا اتفاق ہوا جس زمانے میں علامہ اقبال انارکلی میں رہتے تھے وہ درحقیقت اسم بائسی تھے۔ نور محمدی اُن کے چہرے پر تھلی تھا۔ ایک محمدی کیفیت ان میں یہ تھی کہ وہ بی اُمی کی طرح

نوشت و خواند کے معاملے میں اُمی تھے"

اس سے قطع لنظر کہ جملوں کی ترتیب ہی فلسط ہے، خلیفہ صاحب حضور (福德اء اُمی وابی)

کے ادب و احترام کی حدود سے بچپن گئے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ اسہم باہمی کے معانی کیا ہیں۔ فرماتے ہیں: ایک محمدی کیفیت اُن سیں یہ تھی، گویا ان میں کہی ایک محمدی کیفیتیں تھیں اور وہ کیا کہ نبی اُمیٰ کی طرح نوشت و خواند کے معاملے میں اُمیٰ تھے۔ — ایک چیز ہے سہو، ایک ہے جہالت۔ خلیفہ صاحب جہالت کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں ”طرح“ کے معنی معلوم ہوتے تو کبھی شیخ نور محمد کو حضور کی طرح اُمیٰ نہ لکھتے، لیکن خلیفہ صاحب کا اسلام چونکہ صلبی تھا اور دماغ افرنجی اس لیے حضور کے مرتبہ و مقام سے نابلد تھے۔ اور نہ انہیں معلوم تھا کہ حضور کا نام لکھنے وقت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ یہ ہے لکھنے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے ساری کتاب میں کہیں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ

چہ بے خبر ز مقامِ محمد عَرَبِیٰ سُت

فکرِ اقبال کا ہر باب تجزیہ و تنقید کا مستحق ہے۔ لیکن چند ہی باتوں کی تذلیل سے پوری کتاب سامنے آ جاتی اور اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب نے کیا لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی غظیم شخصیت کے عیناً پرکھڑے ہو کر انہوں نے اقبال کی تغذیہ کی اور اُن کی منزلت کا راگ چھپ کر اپنے خیالات کے انڈھیروں میں ڈاک ٹوٹایا ماری ہیں۔ اگر کلام اقبال اور فکارِ اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوتا تو سطحیات کے دیرانے میں چل قدمی نہ کرتے۔ اقبال کو اقبال ہی کے مقام سے پیش کرتے، لیکن بہت سچھ لکھنے کے باوجود وہ نظریاتِ اقبال کا ادراک نہیں رکھتے، اور نہ انہیں تصوّراتِ اقبال کے حدود سے آگاہی ہے۔

اقبال کے مُستند مجموعوں میں کل بارہ ہزار چار سو اکاؤنٹے (۱۹۳۹ء) اشعار ہیں جن میں چورانوے اشعار اور ایک مصرعہ دوسرے شعراء کے ہیں۔ راقم نے ۱۹۳۰ء میں کلام اقبال کا مُطَالَثَرُ کیا اور آج اس کو پہنچا لیں برس ہوتے ہیں۔ راقم کے نزدیک کلام اقبال

کے عناصرِ خمسہ حسب ذیل ہیں:

اولًا۔ خودی۔ اقبال نے مختلف مقالوں اور بعض خطوط میں بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک خودی کا مطلب ہے احسانِ نفس، معرفتِ حق اور تعینِ ذات۔ اُن کے اپنے الفاظ میں خودی کا عرفان قرآن کے سوا اور کہیں نہیں۔ کیونکہ حدودِ خودی کے تعین کا نام تحریعت اور تحریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔

ثانیاً۔ مشرق کی نشأة ثانیہ! اس بارے میں اُن کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب کے بُطْلَان اور مشرق پر الْقَيَّان سے ایشیا کوئی زندگی مل سکتی ہے۔ میاں شیر احمد ایڈیٹر ہمایوں سے علامہ نے فرمایا تھا کہ ”وسطِ ایشیا کے دل پر ایک پیڑی جمی ہوئی ہے۔ میں اُس کو صاف کر دنیا چاہتا ہوں۔“

ثالثاً۔ توحید و رسالت کی اصل پر اسلام سے غیرِ تزلیل و استنگی!

یہ گویا اُن کے افکار کی مرکزی روح ہے۔ اُن کے نزدیک اسلام ہی وہ سانچہ ہے جس میں فرقہ البشر ڈھلتے ہیں۔ وہ توحید اور ختم نبیوت کو مسلمانوں کی وحدت کا اساسی مخوز قرار دیتے اور فرماتے کہ دونوں میں سے ایک کی نفعی پوری عمارت کو ڈھا دتی ہے۔

رابعاً۔ تنقیدِ مغرب۔ اُن کے نزدیک مغرب اپنے عُرُوجِ داقبال کے باوْضُفتِ تنقید کا نہیں، تنقید کا مستحق ہے۔ فرماتے: اسلام کی نشأة ثانیہ کا آغازِ مغرب کے ہر نوعیِ استیلااد اور سہی جہتیِ اقتدار کی تباہی پر ہے۔ اُن کے نزدیک مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے، اور مغربی کا الجوں میں پڑھے ہوئے نوجوانوں کو دہ رُوحانی اعتبار سے فرمایا یہ سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو خطوطِ بنام سید سلیمان ندوی و عبد الماجد دریابادی)۔ ”تشکیلِ جدیدِ الہیات“ کے چھٹے خطے میں فرماتے ہیں کہ یورپ سے بڑھ کر ان کے اخلاقی ارتقاء کی راہ میں بڑی رکاوٹ کوئی نہیں ہے۔

خامساً۔ عشق کی بختی اور عقل کی خامکاری، —

عشق نہ ہو تو شرع و دلیں تبکدہ تصویرات

شاطئی کے الفاظ میں اُن کا خیال تھا کہ فکر کو حقیقی کی علم کو لقین کی، اور عمل کو محکم اس کی ضرورت ہے، جب یہ یعنی خصائص فرد یا جماعت میں تحریک کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کا اجتماعی پیکر عشق سے جلا پاتا ہے، اُن کے کلام میں جہاں آرزو کا لفظ آیا ہے اُس سے مراد عشق ہے، اور جہاں جستجو کا لفظ آیا ہے وہاں اُس کا مطلب عقل ہے۔

«فکرِ اقبال» شروع سے آخر تک کلام اقبال کے ان عنصرِ حمسہ کی تصریحات و توصیحات سے محروم ہے اگر ان کے مطالب و معانی پر کسی گفتگو کی ہے تو وہ اقبال کی مندرجہ بالا تصریحات و توضیحات کے الٹ ہے، خلیفہ صاحب نے اقبال کے طائرِ اوفکار کو اپنے بال و پر کر اڑانا چاہا ہے۔ نتیجہ پر وزیر میں کوتاہی محسوس ہوتی ہے۔

ساتواں باب — مغربی تہذیب و تمدن پر علامہ اقبال کی تنقید کے ہنوان سے ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰ پر فرماتے ہیں۔

«اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے، اور یہ مخالفت اُن کے رُگ و پے میں اس قدر رچی ہوتی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جاویے جا اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ اثر ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھانی دیتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تحلی ہے۔ بعض نظموں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت عرفان تصور اور ذوق و شوق کے اشعار کہتے کہتے یونہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بال جبریل کی اکثر غزلیں بہت دلولہ امگیز ہیں۔ اکثر اشعار میں حکمت اور عشق کی رلکش آمیزش ہے، لیکن اچھے اشعار کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بے زاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور

پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ عیوب سے لبریز
ہی، لیکن یہاں اس کا ذکر نہ ہی کیا جاتا تو اچھا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقصداً آبِ رواں کا لبِ جو بیجے لطفِ اٹھا
رہے تھے کہ اس میں کبیک ایک مردہ جانور کی لاش بھی تیرتی ہر قی سامنے آگئی۔

ایک غزل کا مطلع ہے کہ ہے

اک دانشِ نورانی اک دانشِ بُرہانی
ہے دانشِ بُرہانی حیرت کی فردوانی
اس کے باقی اشعار بھی اسی طرح کے بلند پایہ ہیں، لیکن چلتے چلتے ایک یہ شعر
بھی فرمادیا جس میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھی مہتمم کیا ہے ہے
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

اور کئی غزلوں میں بھی یہی کیفیت ہے کہ بات کچھ بھی ہو رہی ہو لیکن فرب
لگانے کے لیے فرنگ کا ذکر لازمی ہے ہے

علاجِ آتشِ رومی کے سوژ میں ہے ترا
تری خرد پر ہے غالب فرنگیں کافسوں

علامہ اقبال کی وہ غزل ہے

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرانہ تن

خلیفہ صاحب کے نزدیک ”اسرارِ الہیہ کا خزینہ ہے“ لیکن ان کے نزدیک ایسی عرفانی
غزل میں بھی مقطع سے پہلے فرنگ پڑھو کر لگانا لازمی سمجھتے ہیں ہے

من کی دُنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دُنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و پرہن

ادر خلیفہ صاحب کو یہی ناگوار ہے۔ اسی باب کے صفحہ ۲۱۵ پر لکھتے ہیں کہ:
 ”مغرب کے خلاف اقبال نے اس قدر تکرار کے ساتھ لکھا ہے کہ ٹرپ
 والا اس مغالطے میں بنتلا ہو سکتا ہے کہ اقبال ٹرا مشرق پرست جائیدُلا اور
 رجحت پند ہے“

خلیفہ صاحب نے صفحہ ۲۱۶ پر لکھا ہے کہ
 ”فرنگ کے ہر قریب کو فردوس کی مانند دیکھ کر اُس کا یہ جی چاہتا ہے کہ
 ہماری استیاں بھی جنت کا نمونہ بن جائیں۔ یورپ کے کافر دُن کو دہ اپنے مسلمانوں سے
 زیادہ عملًا اسلام کا پابند سمجھتا ہے اور یورپ کو اس زندگی کی جنتیں حاصل
 ہوتی ہیں ان کو دہ اسی اسلام کا اجر شمار کرنا ہے، جو ان کی زندگی کے بعض
 پہلوؤں میں پایا جاتا ہے۔“

خلیفہ صاحب کی ایک اور آپ کے ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:
 ”مشرق مدت سے فرنگ کے سیل بے پناہ میں بہہ رہا ہے۔ اب اقبال کی

پیشگوئی ہے۔“

خبر ملی ہے خدا یاں بخزد بر سے مجھے
 فرنگ ریکہذر سیل بے پناہ میں ہے
 چلو قصہ تمام ہوا، ہم تو ڈوبے تھے صتم تم کو بھی لے ڈو میں گے۔“
 خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ خلیفہ صاحب نے اقبال کو پیش کیا ہے یا اقبال کی اوث میں
 اپنے نئیں پیش کیا ہے۔

جہاں تک محولہ اقتیاسات کا تعلق ہے، خلیفہ صاحب انشا کے اصولوں سے واقع
 ہی نہیں، چونکہ وہ کوئی انشا پر داز نہ تھے اس لیے ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں۔ لیکن افرنگ کا دفاع
 خلیفہ صاحب کے فہم کا فتوڑ تھا، یادہ سرستید کے الفاظ میں مسلمان انگریز تھے کہ دین کے علارو

فضلہ مکی تو ہیں کے لیے کلامِ اقبال کو نورِ مور کر پیش کرنا ان کا شعار تھا۔ فرنگ سے متعلق فرمودہ اقبال ان کے نزدیک مسخران تھا، اور مغرب پر ان کی تنقید پسند نہ کرتے تھے۔

خلیفہ صاحب مبادیاتِ اقبال سے آگاہ ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ پورپ نے معاشرہ انسانی کے لیے کم ہبک عوارض کو حنیم دیا ہے اور اس کے فکری استیلاہ نے اُس کے مآڈی استبداد کی معرفت نسل انسانی پر کیا بتم ڈھلتے ہیں۔

اقبال کی مغرب پر تنقید اس دور کی سب سے بڑی ضرورت تھی اور ہے یہ اقبال کے طرزِ مُحاطبَت کی مسراج ہے کہ وہ مختلف زاویوں سے مغرب کی اجتماعی مُفسرتوں پر حملہ اور ہوتے اور مسلمانوں کے انفرادی ضمیر کو جھینجھوڑتے ہیں۔ اقبال جس معاشرہ میں اسلامی مفکر تھے، وہ پورپی استیلاہ کا معاشرہ تھا، وہ اس معاشرے کے نکتہ چیز نہ ہوتے تو پھر ان کی دعوت کا میدان کہا تھا؛ اور عامتہ المسلمين کے لیے جدوجہد کے خطوط کیا تھے؟

شرق اسلامی روایات کا مرجع تھا، خلیفہ صاحب کو اس کے اختاط و ادب کا اندازہ ہوتا یا ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا احساس کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اقبال نے فرنگ پر تنقید کی تو یہ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ناگزیر تھا۔ جس طرح پھر دل کے بغیر بھاؤ دل کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح فرنگ کی بالادستی کو چیخ کیے بغیر مشرق کے مرعوب ذہن کو، اس حصار سے نکالنا مشکل ہے۔ علامہ اقبال نے پورپی دانش و حکمت کے خلاف اتحاج کیا تو سبب یہ تھا کہ جدوجہد مسلمان ان کا شکار ہو چکے تھے۔ خلیفہ صاحب بھی اسی دانش و حکمت کا ایک صید تھے۔

”فکرِ اقبال کی سیاسی و تاریخی غلطیوں کا شمار کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مُرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن مُصنف کی کجر دیوں کا مختصر جائزہ ساری کتاب کا چہرہ نما ہے۔ اس کے علاوہ خلیفہ صاحب نے کئی ایک فروعی غلطیاں کی ہیں۔ فرماتے ہیں۔“

”سید احمد خاں اور ان کے شرکاء کا رشیلی، حالی، چراغ علی، نذریہ احمد اور“

مولوی ذکار اللہ، شعوری یا غیر شعوری مدور پر محسوس کرتے تھے کہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون ہی نہیں بلکہ اخلاق کے معیار بھی مغرب سے حاصل کرنے چاہیں۔

کیا ان سب پر یہ بہتان نہیں؟ شبی، حالمی، اور زندیر احمد، یورپ سے مرعوب و مغلوب تھے تو پھر مسلمانوں کا خدا حافظ تھا۔ خلیفہ صاحب نے سالک و عابد کی طرح اقبال کی سیرت پر بر الفاظ ذیل کرم فرمائی کی ہے:

”اقبال رندی اور شباب کے زمانے میں بھی عاشقی کے محلے میں کریم و گزشتے“ ہی تھا، اور دل کبھی نہ باختہ“ میں اپنی نسبت صحیح بات کہی ہے ”وہ مصری کی سکھی تھا شہد کی سکھی نہ تھا“ (صفحہ ۴۲)

خلیفہ صاحب لکھتے ہیں کہ

”اقبال کے نزدیک جنت یادو زخم مقامی نہیں بلکہ نفسی ہیں۔“

یہ خیال کہاں سے اخذ کیا ہے؟ خلیفہ صاحب فرمادیتے تو یہم اُن کے شکر گزار ہوتے، لیکن اپنے خیالات کو اقبال کے سرمنڈھنا ابلہانہ جسارت ہے۔

معلوم ہوتا ہے خلیفہ صاحب کا مطالعہ اقبال محدود و مختصر تھا۔ انہوں نے اقبال کو ٹھاکر در تھا لیکن غور نہ کیا تھا، اُن کی نگاہ سے اقبال کے خطبات و بیانات اور خطوط و مقالات گزرے ہوتے تو فکر اقبال کے فہم و شعور میں آسانی ہوتی، وہ یورپ سے فلسفہ پڑھ کے آتے تھے، اور اُسی فلسفے کے تعلیم کی دوڑبی ریاستوں میں مدرس رہے تھے، اُن کے یہ اقبال محض ایک شاعر تھا۔ اس کے غلکرو شاعری کی ترازوں میں تولتے رہے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ حقائقِ اسلامیہ کیا ہیں؟ اقبال نے مطلع نظر کیا تھا؟ اس کی ذہنی سرگزشت کیا ہے؟ اس کے مأخذ کیا تھے؟ اُس کی آرزو کیا تھی، اور اس کی جستجو کیں مراحل سے تکلی اور کہاں تک پہنچی؟ خلیفہ صاحب نے محسوس ہی نہ کیا کہ اقبال کے شب و روز میں پیچ و تابِ رازی کی امنگ اور ”سوز و سازِ رومی“ کی ترزنگ کے احوال کیا ہیں؟ انہیں اقبال

کے متعلق یاد رہا تو اس قدر کہ وہ لہو و لعوب کی زندگی میں کر دے و گذشتے قسم کے انسان تھے، اقبال نے عرشی سے کہا تھا "افسوس ہم اچھے زمانے میں پیدا نہیں ہوتے" خلیفہ صاحب نے فکر اقبال لکھ کر اپنے ذہنی افلات سے اس کی توثیق کی، وہ اندازہ ہی نہیں کر پاتے کہ اقبال نے کہاں سے کیا بات کہی ہے اور ان کے کلام میں تضاد نہیں نشوّع ہے۔ ان کے ذہن کا خصاً ذرائع علم کے یورپی مأخذ پر نہیں تھا۔ ان کے نزدیک از روٰتے قرآن علم کے چاز ذریعے تھے: پہلا: وَحَىٰ، جو ختم ہو چکا، لیکن قرآن موجود ہے۔
دوسرा: آثار قدما و احوال تاریخ۔ کلام پاک میں ایام اللہ سے مراد تاریخ ہے۔
تیسرا: علم النفس۔ جس کا آغاز قی اَفْسِكُمْ اَفْلَا شِعْرُونَ سے ہوتا ہے۔
چوتھا: صحیفۃ فطرت۔

خلیفہ صاحب نے ان حقائق سے نا بلد ہونے کے باعث فکر اقبال کو اپنے ذہن کی غابت سے مجرد کیا ہے۔
اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور کے صدارتی خطبہ را ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء میں کہا تھا کہ:

"ہم اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نا بلد ہیں اور ساتھ ہی فرمایا کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکتِ احمدے ہر وقت اپنا رفتی بناتے رکھنا گویا اپنے تین اس تمدن کا حلقة گبوش نیا لینا ہے اور یہ وہ حلقة گبوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کو قبول نے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ یاد رہے کہ عصیت سے مراد قومی پاسداری ہے"

خواجہ عبد الوہید سے فرمایا: "تہذیب مغربی تباہ ہو جاتے تو اسلام کا بول بالا ہو گا" (ملفوظات)۔ روزگارِ فقیر حصہ دوم کے مصنف نے صفحہ ۱۸۵ پر علامہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ یورپ کی بنی ہموئی چیزیں خوصیت ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں اخلاقی زیرستوتا ہے۔

خلیفہ صاحب نے اس ظاہری حسن سے مُعوب ہو کر کلامِ اقبال کے باطنی اضطراب کو
محسوس نہیں کیا، بلکہ مغرب پران کی شقید کو علمی لحاظ سے قتلِ عمد قرار دیا ہے۔ رہایہ الزام
کہ اقبال یورپ کے حکماء میں سے فلاں فلاں کے خوشہ چین تھے تو خلیفہ صاحب اور ان
کے رفقاء نے اپنی ذہانت کا اشقلہ چھوڑ کر اقبال کے اس اعلان پر ریکیمِ حمد کیا ہے
جو اسرار و رموز کی معرفت بارگاہِ رحمۃ اللعالمین میں ایک عرضہ داشت ہے:

آئے بو صیری راردا بخشندہ بربط سلا مرا بخشندہ
گرد لم آبینہ یے جو ہر است در بحر فم غیر قرآن مُفسر است
پر دہ ناموسِ فکر م چاک کن ایں خیاں را ز خام پاک کن
رذ محشر خوار و رسوائے کن مرا بے نصیب از بو سه پاکن مرا
اقبال کو اندازہ ہو گیا تھا مبادا اس کے چشتان فکر کے گلاب دیا سمن مغرب
کی صرص سے تاراج کیے جاتیں اُنہوں نے پیش بندی کی اور فرمایا:

چورخت خویش برستم ازیں خاک ہمہ گفتہ باما آشنا بُود!
ولیکن کس نداند ایں مسافر چگفت وباکہ گفت از کجا بُود
اور غالباً خلیفہ صاحب ایسے عبقروں کی ذہانت ہی کے لاشہ دین پر کہا تھا:

ہ ز من گیر ایں کہ مرد کو رچنے
ز بنیاتے غلط بینے نکو تر
ز من گیر ایں کہ نادانے نکو کیش
ز دانشمند بے دینے نکو تر

